تقلید بھی بے سوچے سمجھے نہ کی جائے، انکی علمی زندگی کا یہی طرۂ امتیاز تھا، اور یہی پیغام وہ ہمیں دے گئے ہیں"۔ یہ نمبر مولانا کی سیرت و شخصیت اور انکی علمی، ادبی اور دینی خدمات کو سمجھنے کیلئے بہت مفید ہوگا اس سے ان پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مگر اس نمبر میں مولانا کی قرآنی خدمات پر سیر حاصل بحث رہ گئی ہے نیز انکے بعض تفردات خصوصاً احادیث اور بعض تفسیری مسائل سے اہل علم کے بڑے طبقہ کو جو اختلاف تھا اس پر بھی مبسوط گفتگو کی ضرورت تھی۔

نیا دور منشی نولکشور نمبر :۔ مرتبہ جناب امیر احمد صدیقی و شاہ نواز قریشی صاحبان، سائز لمبا، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۶ قیمت ایک روپیہ، پتہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش۔

اردو کے محسنین میں آنجہانی منشی نولکشور کا نام سر فہرست ہے، ان کے مطبع کی ملک کے کئی بڑے شہروں میں شاخیں تھیں اور اسکی بدولت اردو اور ہندی ہی نہیں فارسی و عربی کی بھی بیشمار نادر و نایاب کتابیں شائع ہوئیں جسکی وجہ سے اسلامی علوم و فنون کا بیش قیمت ذخیرہ دستبرد حوادث سے محفوظ رہا، اترپردیش کی حکومت کا رسالہ ماہنامہ نیا دور کو معیاری، بلند پایہ اور ضخیم نمبروں کی اشاعت کیلئے نیک نامی اور بڑی شہرت حاصل ہے، ہمیشہ میں اس نے اردو کے اس محسن اور اسلامی علوم کے خدمت گزار کی قدر دانی کی غرض سے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے جو منشی جی کی سیرت و شخصیت و کمالات اور ان کے مطبع کی شاندار خدمات پر مضامین و منظومات پر مشتمل ہے، مضمون نگاروں میں ڈاکٹر نور الحسن، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر انوار الحسن، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر عبد الاحد خلیل، امیر حسن نورانی، جناب امین سلونوی، مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، کنور مہندر سنگھ بیدی، حکیم عبد القوی دریابادی، ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر نیر مسعود، مولوی شمس تبریز خان، ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، مضامین میں منشی جی کے حالات و سوانح، طباعت و اشاعت میں انکے غیر معمولی اہتمام اور مطبع کی عظیم الشان خدمات، نیز منشی جی کے جاری کردہ اودھ اخبار وغیرہ کے بارہ میں بھی بڑے معلومات اکٹھا کئے گئے ہیں بعض مضامین میں منشی جی کے ہم عصر معاصرین سے انکے تعلقات کا ذکر بھی ہے، منظومات کا حصہ بھی معیاری ہے، علم و فن کے اس خادم پر یہ نمبر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

"ع، پ"

جلد ۱۳۰ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

۱۱؍نومبر ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ اس مرتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا،

اس میں کرنل بشیر حسین زیدی (دہلی) جناب اطہر حسین آئی اے ایس (لکھنؤ) جناب ضیاء الحسن فاروقی (دہلی) جناب سید شہاب الدین دسنوی (دہلی) فضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن (مدراس) اور مولانا محمد رابع ندوی (لکھنؤ) شریک ہوئے ۱۹۸۳ء کا بجٹ منظور ہوا مختلف تجویزوں میں یاد زور اس پر دیا گیا کہ فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان کو عمل میں لانے کی کیا صورتیں اختیار کی جائیں، ان تجویزوں کا ذکر معارف کے صفحات میں آچکا ہے، ناظرین کو پھر یاد دلا دیا جائے ان تجویزوں میں ایک اہم تجویز یہ ہے کہ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو لٹریچر موجود ہے، اور آئندہ بھی جو لٹریچر سامنے آئے، اس کا علمی مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے، اور علمی و معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کو واشگاف کرنے کے لئے ایک واضح تصنیفی و تالیفی پروگرام مرتب کیا جائے، اسلام، تاریخ اسلام، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں اور ان کے فکری، علمی اور ادبی کارناموں سے متعلق اسکول سے لیکر یونیورسٹیوں کی سطح کے طلبہ کے لئے جدید مذاق کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں، جو ان کے تعلیمی نصاب کا حصہ بن سکیں، اور جن سے تعلیم و تدریس کی ہر سطح پر بچوں اور نوجوانوں کے ذہن کی تربیت کا کام لیا جا سکے،

یہ تجویز بھی منظور ہوئی تھی کہ اسلامی موضوعات پر حوالہ جات کی معیاری کتابیں تیار کی جائیں، اسلام سے متعلق علم و تحقیق کے جو ادارے پہلے سے موجود ہیں، ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے واقفیت

حاصل کی جائے، اور ان کے یہاں جو کام ہو رہا ہے، اسے موجودہ علمی و تحقیقی معیار کے مطابق مفید تر بنانے کی کوشش کی جائے، تصنیف و تالیف کے اس تمام کام کا علمی معیار اور تعلیمی مرتبہ دنیا کے موجودہ معیار تحقیق اور جدید اصول تعلیم کے مطابق ہو تاکہ ان کتابوں کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم سب ہی لوگ دلچسپی سے کریں اور مستشرقین کی کتابوں سے مستغنی ہو سکیں، دارالمصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گراں قدر مطبوعات پیش کی ہیں ان کو عربی زبان اور آج کی زندہ یورپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے تاکہ ان سے بڑے معیار پر استفادہ کیا جا سکے،

اس طویل المدت کام کو انجام دینے کے لئے ایک مشاورتی مجلس کی تشکیل بھی کی گئی تھی جس کے ارکین ہندوستان کے علاوہ سعودی عرب، پاکستان، ایران، انگلستان، انڈونیشیا، مراکش، ملیشیا اور جنوبی افریقہ کے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان اراکین کا اجتماع کہیں ایک بار ہو جائے تاکہ مذکورہ بالا تجویزوں کو عمل میں لانے کی تدابیر پر غور کیا جا سکے، ان کو کسی ایک جگہ جمع کرنے میں کافی اخراجات کی ضرورت ہوگی، اس لئے سردست ان سے خط و کتابت جاری ہے مگر بعض اراکین کے یہاں سے جوابات موصول نہیں ہو رہے ہیں، شاید صحیح پتہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو خطوط نہ مل رہے ہوں، لندن کے پندرہ روزہ اخبار امپیکٹ میں ان کے اسمائے گرامی شائع کئے جا رہے ہیں کہ وہ اپنے صحیح پتوں سے مطلع کر کے اس کام کو آگے بڑھانے میں مدد دیں،

سردست ہم کو دو ایسے اچھے اہل قلم کی ضرورت ہے جو انگریزی اور عربی میں اچھی صلاحیت رکھتے ہوں، وہ اچھی انگریزی اور عربی میں خط و کتابت کرنے کے علاوہ اسلام اور مستشرقین کے سلسلہ میں تصنیف اور ترجمے کا کام بھی کر سکیں، اس کار خیر میں مدد دینے کے لئے جو اہل علم تیار ہوں، وہ راقم کو مطلع کریں، ان کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مستشرقین پر جو کچھ لکھا ہے، وہ دو جلدوں

میں جمع کر دیا گیا ہے، ان کی کتابت و طباعت کا سامان کیا جارہا ہے سیمینار میں عربی اور اردو میں جو مضامین پڑھے گئے تھے، ان کی طباعت بھی جلد ہو جائے گی، اس سیمینار سے جو جذباتی اور علمی فضا قائم ہو گئی ہے، اس کو ہر حال میں باقی رکھنے کی ضرورت ہے،

راقم نے علامہ شبلی نعمانی کی مشہور کتاب اورنگزیب عالمگیر کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اور انگریزی میں ایک کتاب امیر خسرو اے جینیس (AMIR KHUSRAU AS A GENIUS) کے عنوان سے لکھی ہے یہ دونوں کتابیں ادارۂ ادبیات دلی، ۲۰۰۹ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے بہت ہی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہیں پہلی کتاب کی قیمت تین سو روپیہ اور دوسری کی پچاس روپیہ ہے ادارۂ ادبیات دہلی یا دار المصنفین سے منگائی جا سکتی ہیں،

جناب سید اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مقبول کتاب سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ بہت ہی سلیس اور رواں انگریزی میں کیا ہے، یہ اسلامک بک پبلشرز پوسٹ بکس ۲۱۰۸۹ صفحات، کویت سے شائع ہوئی ہے اس کے نسخے دار المصنفین کے دار الاشاعت سے بھی مل سکتے ہیں،

---

۳ دسمبر [illegible] دسمبر [illegible] تک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تغلق آباد دہلی میں قرآن مجید پر دوسری بین الاقوامی کانگریس ہو رہی ہے، اس تحریر کے لکھتے وقت خبریں ملی ہیں کہ اس میں بیرونی ممالک کے کثیر تعداد میں مندوبین شریک ہو رہے ہیں، دعا ہے کہ اس اجتماع میں نزول قرآن کا جو اصلی مقصد ہے، وہ حاصل ہو، اس کے مذاکرہ میں یہ اچھی طرح واضح کر دیا جائے کہ یہ ام الکتاب ہے، اس میں انسانیت کو سنوارنے کے لئے آخری پیام الٰہی ہے جس میں ابدیت ہے اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو باطل کے ہتھیار سے اس حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے اور جب اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ ان سے منہ پھیر لے،

مقالات

مستشرقین اور اسلام

از

الاستاذ انور الجندی، قاہرہ، مترجمہ عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق دار المصنفین

قرآن کریم، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت نبویؐ سے متعلق مستشرقین کے افکار کا تجزیہ کرنے سے پہلے ایک مختصر جائزہ اس لئے پیش کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے بارہ میں وہ کس انداز سے سوچتے ہیں،

بنیادی طور پر اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا موقف اُن کے مغربی طرز کے مذہبی فہم و ادراک سے ماخوذ و مستعار ہے، یہ فہم بیک وقت کوتاہ، محدود اور گنجلک ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اسلام کی وہ تشریحیں اور تعبیریں ہیں، جن کو یہودی عالموں اور پادریوں نے پیش کیا، اسلام اپنے آپ کو تمام آسمانی مذاہب کا خاتم کہتا ہے اور ان سابقہ مذہبوں کی تصدیق کرتا ہے لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کی تشریحیں، اسلام سے کسی قسم کا تعلق پسند نہیں کرتیں، اور یہیں سے وہ اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ امر واقعہ ہے کہ گزشتہ الہامی کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے متعلق خوش خبریاں اور پیشین گوئیاں موجود تھیں لیکن یہودی اور عیسائی علماء کی کوتاہ نظری اور بے بصیرتی نے اس آئینۂ حق کو ہمیشہ گہنہ آلود

ہی دیکھنا پسند کیا، انھوں نے اسلام پر اگر نظر بھی ڈالی تو اس طرح کہ گویا اسلام ان لوگوں کے اعتقادات وخیالات سے مخالف کوئی چیز ہے، یا پھر ان کی مذہبی کتابوں سے ماخوذ و مسخ شدہ کوئی مذہب ہے، حق یہ ہے کہ سارے مذاہب خدا کی جانب سے ہی تھے، اور ان مذہبوں کا سلسلہ ازل سے تکمیل کے مراحل میں تھا، اسلام سے اس سلسلہ کی تکمیل ہوئی، دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان مختلف مذہبوں اور شریعتوں میں عقیدہ سے متعلق خدا کے دین کے تمام اصول تقریباً یکساں ہیں، اور یہ قطعاً حیرت انگیز بات نہیں لیکن اصولوں میں اس اشتراک کی وجہ سے شبہات پیدا کر دینا یا موازنہ کرنے کی کوشش بھی کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ مستشرقین کرتے ہیں، دوسری الہامی کتابوں میں تحریف وترمیم کا عمل ایک تاریخی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ صرف قرآن ہی وہ الہامی کتاب ہے جو آج تک بعینہٖ نصِ ربانی کے مطابق اپنی اصلی شکل میں محفوظ و موجود ہے، مستشرقین کے رُخ کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل چند نکات بھی نہایت اہم ہیں،

۱۔ مستشرقین نے اسلام کو سمجھنے کے لئے روحانیات سے صرف نظر کر کے خالص مادی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، وہ یہ نہیں تسلیم کرتے کہ وحی، نبوت اور قرآن پاک کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذہبوں کے بارہ میں بھی ان کا دائرۂ نظر محدود ہے، یہاں تک کہ وہ انجیل کو کلام الٰہی نہیں مانتے، بلکہ اس کو کلام الرسل ہی کہتے ہیں اور اس طرح وہ الوہیت اور نبوت کے درجات میں خلط مبحث کر دیتے ہیں،

۲۔ اسلام کو جس طرح اچانک اور وسیع پیمانہ پر فروغ ہوا، اور جزیرۂ عرب میں وہ جس طرح بآسانی برسر اقتدار ہوا، مستشرقین اس کا بھی جائزہ لیتے ہیں، لیکن ان کا تجزیہ صرف حقیقت کے برعکس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس جوہر خاص کی قدر وقیمت کو بھی کم کر کے پیش کرتے ہیں جس کو اسلام نے انسانیت کے لئے خصوصاً ان قوموں میں پیش کیا، جو عرصہ سے رومیوں کے پنجۂ استبداد

میں جکڑی ہوئی تھیں، ان مستشرقین کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ عرب ایک ابھرتی ہوئی قوم تھی، ان کی اپنی تہذیب تھی، وہ ترقی کی صلاحیت رکھتی تھی، ایسے میں نبی کریمؐ کا ظہور ہوا، اور آپ نے صرف یہ کیا کہ اس ابھرتی ہوئی قوم کی قیادت کی، اور اس طرح عرب شاہراہ ترقی پر گامزن ہوگئے، یہ تجزیہ بنیادی طور پر حقیقت کی تصویر کشی نہیں کرتا، بلکہ اس اسلامی دعوت کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے، جو واضح طور پر انسانیت کو تاریکی سے روشنی میں لانے کا سبب بنی، اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کس طرح شروع کے تیرہ برسوں میں، اس دعوت کے ساتھ پیش آئے، اہل مکہ کے سخت عناد اور انتہائی مخالفت کے بعد نبی کریمؐ ایک ایسے دوسرے ماحول و معاشرہ کی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے، جو خدا کی دعوت کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا تھا، آپ نے یہ مطلوبہ معیار یثرب کی بستی میں پایا، اور اس طرح ہجرت کا تاریخی عمل وجود میں آیا، پھر یہ دعوی کرنا تو نری جہالت ہے کہ عرب ایک ترقی پذیر قوم تھی، عرب عروج اور ترقی کی سمتوں اور جہتوں سے بالکل ناآشنا تھے، وہ بتوں کے پجاری، مردار کھانے والے، بچیوں کو زندہ درگور کر دینے والے، شراب نوشی کے عادی، قتل و غارت گری اور زنا کے خوگر تھے، تمدنی ترقی کی کوئی رمق ان میں موجود نہ تھی، یہ صرف اسلام تھا جس نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ان کو خدائے واحد پر ایمان لانے اور اپنے رب کے لئے جانی و مالی قربانیاں دینے کے لئے تیار کیا، ان اخلاقی کمالات سے آراستہ ہو کر جب وہ آگے بڑھے، تو غیر قوموں اور غیر ملکوں نے خود اپنے دروازے ان کے لئے وا کر دیئے اور مسرت کے جذبات کے ساتھ ان کا استقبال کر کے ان کی عدل گستری اور رحم دلی پر اعتماد کیا،

۳۔ مستشرقین نے اسلام سے پہلے کے زمانہ جاہلیت اور عربوں کی بت پرستی کے مطالعہ

پر خصوصی توجہ دی، اور کوشش کی کہ ان جھروکوں سے عرب اور اسلام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیں، زمانۂ جاہلیت کے وحشیانہ افعال و اعمال میں ان مستشرقین کو زیادہ دلکشی نظر آئی، چنانچہ اس دور کو عہدِ شجاعت قرار دیا، ہیملٹن گب نے دورِ جاہلیت میں قوت و ثروت کے بعض مظاہر کو نمایاں کر کے یہی ثابت کرنا چاہا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس بدترین معاشرہ میں کہیں کہیں قوت، حمیت اور سخاوت کی ایسی چنگاریاں بھی تھیں، جو دینِ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے خاکستر میں کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں، لیکن ان جزئی و لمحاتی خوبیوں کو ایک پورے عہد کی خوبی قرار دینا صرف مستشرقین کا کارنامہ ہے جن کا مقصد عربوں کی مدح نہیں بلکہ وہ تحسین آمیز تنقیص ہے جس کے ذریعہ دورِ جاہلیت کو سربلند قرار دیا جاتا ہے، اور اسلام کو اس سربلندی کا محض ایک خوشہ چین ثابت کیا جاتا ہے، مدینہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات میں اسی قسم کے سلسلے قائم کئے گئے، اسلام سے پہلے کے مذاہب اور عرب کی پڑوسی حکومتوں اور غسان و منذر کی سلطنتوں کو بھی ان مستشرقین نے اسی لئے زیادہ اہمیت دی تاکہ کسی طرح یہ ثابت کیا جا سکے کہ انہی سارے پس منظروں میں مسلمانوں نے اپنی راہ کا تعین کیا۔

۴- واقعات کے استنباط میں مستشرقین کا طرزِ استدلال واضح طور پر ان کی بدنیتی کی غمازی کرتا ہے، مثلاً ہیملٹن گب اپنی کتاب بنية الفكر الديني في الاسلام میں لکھتے ہیں، حالات و ماحول کے ماتحت قدیم عربی تہذیب کا احیاء ہو رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی ماحول سے تھا، طبعاً آپ پر اس ماحول کے اثرات مترتب ہوئے، آپ نے اس قدیم عربی تہذیب میں چند مذہبی عقائد کا اضافہ کر کے اسے اسلام کی صورت میں پیش کر دیا، گب قدیم عربی تہذیب کے احیاء سے توہم پرستی اور جاہلانہ اعتقادات مراد لیتے ہیں، مثلاً جادو، ٹونا، ستارہ پرستی، اور کہانت وغیرہ، گب کی اس رائے کو یہاں نقل کرنے کا مقصد

یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کے اس رویہ کی وضاحت کی جائے کہ یہ لوگ اول تو چند مفروضات قائم کرتے ہیں، پھر وہ واقعات اور قرائن سے ان مفروضات کو قطعی اور یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کوشش میں وہ واقعات کو گھڑنے میں یا ان میں کتر بیونت کرنے میں یا تحریف و تغییر میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ہیں، گب نے مندرجہ بالا رائے کی تائید میں حجۃ اللہ البالغہ سے شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک قول نقل کیا ہے، حالانکہ چند ہی سطروں کے بعد ان کی رائے کی نفی میں شاہ صاحب کا قول موجود ہے، گب صاحب ایسے ہی مفروضات قائم کر کے یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ حضرت محمد نبی نہیں تھے، عربوں کے وہ رسم و رواج جن کو عہدِ ابراہیمی کا ورثہ سمجھا جاتا تھا، دراصل ان عربوں کے اپنے قائم کئے ہوئے تھے، حضرت ابراہیمؑ سے ان رسموں اور رواجوں کا تعلق نہیں تھا خود کعبہ کے تقدس میں دعائے ابراہیمی کا کوئی اثر نہیں تھا، کعبہ کی حرمت، عرب ماحول کی ایک رسمی سی چیز تھی، گب یہ بھی کہتے ہیں کہ جنات محض ایک وہمی مخلوق ہیں، اور ان کے بارے میں قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، یا دوسرے واقعات میں ان کا جو ذکر آتا ہے، وہ بھی نرا وہم ہے، گب ان تمام مفروضات کو ثابت کرنے میں جملوں کے ہیر پھیر اور عبارت کو معمہ بنانے میں سارا زور صرف کرتے ہیں،

۴- مستشرقین جب واضح اور اہم حقیقتوں کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں، اُس وقت بھی وہ عصبیت بلکہ اپنے نفس کے اسیر و مرید نظر آتے ہیں، مثلاً تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمان کثرت سے جنگوں میں فتح یاب ہوئے، اور ان معرکوں میں ان کی فردی و عددی قوت ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں کمزور و کمتر ہی رہی، لیکن تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ فتح مند اور غالب رہے لیکن جنرل گلوب اپنی کتاب الفتوحات العربية الكبرىٰ میں ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان فنِ حرب سے نا آشنا یا اس فن میں پس ماندہ تھے، حالانکہ

فوجی صلاحیتوں اور جنگ کے حربوں میں مسلمانوں کی برتری ایک مسلمہ حقیقت ہے، انصاف پسند مورخوں نے مسلمانوں کی ترقی یافتہ صلاحیتِ جنگ، موقع و محل کے انتخاب اور تکنیکی اعتبار سے ان کی قائدانہ مہارت کی برتری کا اعتراف کیا ہے، اسلام کے آغاز میں جو جنگیں ہوئیں اور جو اسلامی فتوحات حاصل ہوئیں، وہ تو اپنے امتیاز کی وجہ سے صدیوں اپنی مثال آپ رہیں، (علم الحرب منیر شفیق)

عصر اول میں مسلمانوں نے جنگ کے میدانوں میں ساری بلندیوں سے برتر بلندی پر اپنا علم نصب کیا، اور نپولین کے دور تک کوئی بھی اس چوٹی کو سر نہ کر سکا، اس کے علاوہ اسلامی جہاد کا مقصد صرف جنگ ہی تو نہیں ہے، بلکہ اس کے جلو میں خدا پر ایمان اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی اور وہ جذبۂ حمیت بھی جلوہ گر رہتا ہے جو شوقِ شہادت کا سامان فراہم کرتا ہے،

۵ اسلام میں دنیا و آخرت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، ان مستشرقین نے اس کا بھی جائزہ لیا، اور نتیجہ یہ پیش کیا کہ اسلام کا تصور حیات، دنیا سے روگردانی کی تعلیم دیتا ہے، ایک مستشرق فون دربناوم کا خیال ہے کہ اسلام مسلمانوں کو دنیا اور دنیا کے مظاہر سے کنارہ کش رہنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ مسلمانوں کو صرف آخرت اور اس کی ابدی نعمتوں کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے، زندگی کے بارہ میں اسلام کے اس نقطۂ نظر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم، ادب، سیاست، اور اقتصادیات وغیرہ فانی علوم ہیں، جوہر حیات تو صرف نماز، روزہ جیسی عبادتیں ہیں، گویا موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی و درماندگی کی وجہ ان کی رہبانیت ہے، اس غلط طرزِ فکر کا جواب ایک عرب اہل قلم ڈاکٹر ابراہیم محمد زکی نے یہ کہکر دیا کہ مسلمانوں کی موجودہ خستہ حالی کی یہ تعبیر اسلام کی روح کے ساتھ میل نہیں کھاتی

اسلام عبادت کو عمل پر غالب نہیں کرتا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عمل ہی عبادت ہے، چنانچہ یہ تو سب پر روشن ہے کہ مسلمان صدیوں تک علم کے علمبردار رہے، یورپ کی موجودہ نشأۃ ثانیہ اس کے علمی عروج کے اسباب انہی مسلمانوں ہی کے تو مہیا کردہ تھے، مسلمانوں نے یہ مہیا نہ کیے ہوتے تو شاید یورپ ابھی محو خواب ہی رہتا، مسلمانوں کی خستہ حالی کی وجہ اسلام کا تصور حیات نہیں بلکہ یورپ نے مسلمانوں پر سیاسی بالادستی حاصل کی تو انگریز سامراج نے عالم اسلام کو منظم طریقہ سے علمی، معاشی اور فوجی لحاظ سے مفلوج بنا کر رکھ دیا کہ پھر مسلمان ان میدانوں میں پیش قدمی نہ کر سکیں، مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی ان کے دشمنوں کی وجہ سے ہے، اس میں ان کے مذہب کی تعلیمات کی مطلق کارفرمائی نہیں، اور عجب کیا کہ مستقبل قریب میں مسلمان پھر یہ ثابت کر دکھائیں کہ ان کا دین کبھی پسماندگی کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ یہ تو اسلام ہے، جو ہر ترقی کا ہمیشہ محرک اور سبب بنا رہا ہے، اسلام نے دین و دنیا میں ہمیشہ ایک مضبوط ربط قائم کر رکھا ہے، مذہب کی صحیح روح کو سمجھنے کا نظری ثمرہ علم و عمل، سیاست و معاشیات میں ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، دین و دنیا میں اگر صحیح مطابقت قائم نہ ہوگی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیب خود مسلمانوں میں ہے، یا دنیاوی پس ماندگی مسلمانوں کی تہذیب کا ایک لازمہ ہے، مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب تاریخی ہیں، ان کے ازالہ کے ساتھ یہ پس ماندگی خود بخود ختم ہو جائے گی، پھر مسلمانوں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ پس ماندہ ہیں، اگر یہ پس ماندگی ان کی تہذیب کا جزو ہوتی، تو پھر یہ احساس ہی کیوں پیدا ہوتا، آج مسلمان اپنی زبوں حالی کا تجزیہ کر رہے ہیں، اور تقریباً سارے مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کی خستگی کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام سے روگرداں ہو گئے، اور اس روگردانی میں سامراج کا بڑا ہاتھ ہے، جس نے مغربی مادیات اور نظریات سے ان کو ایک عرصہ تک مسحور کئے رکھا، مغربی اہل قلم

نے سارا زور اس پر صرف کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے بیگانہ کر کے دوسری شاخہائے نازک پر آشیانہ بنانے کی ترغیب دیں،

۶۔ مستشرقین نے اپنی خواہشات اور جذباتِ تعصب کی بنا پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا کوئی مستقبل ہی نہیں، مارگولیوتھ نے ۱۹۰۴ء میں اپنے اسی نتیجۂ فکر سے دنیا کو باخبر کیا، لانس نے ۱۹۳۰ء میں یہی نعرہ بلند کیا، اور دوسرے مستشرقین اسی قسم کی گفتگو کرتے رہے، مگر حالات، واقعات اور اسلام کی روز افزوں اشاعت، زبانِ حال سے ان کے اقوال کی تردید کرتی رہی، پاکستان اور انڈونیشیا کی صورتوں میں نئی اسلامی مملکتیں وجود میں آئیں، خلافت ختم ہوئی لیکن اسلام زندہ رہا، حالانکہ یہی مستشرقین کہا کرتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا بھی سقوط ہو جائے گا، نئے تمدن کے ساتھ جب اسلام دوچار ہوگا، تو لامحالہ پاش پاش ہو جائے گا لیکن مغربی تہذیب کا سامنا اسلام نے کیا، اور بجائے مرعوب و مغلوب ہونے کے اس نے جرات کے ساتھ مغربی تہذیب کی ناسود کی نشاندہی کی، اس کے طوفان کا مقابلہ پامردی سے کیا، اور اس کے غلبہ سے خود کو آزاد رکھا، اور فکرِ اسلامی از سرِ نو اپنے اولین سرچشموں سے سرسبز اور شاداب ہو رہی ہے مستشرقین کا خیال تھا کہ مغرب کی مسیحی مشنریاں، اسلام کا خاتمہ کر دیں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی ساری قوت، ثروت اور وسائل کے باوجود یہ مشنریاں مسلمانوں کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر سکیں، ان ملکوں میں جہاں اسلام کا سیاسی اثر و نفوذ نہیں ہے، اور جہاں مسیحی مشنریاں لاکھوں کی رقم خرچ کر کے فلاحی ادارے قائم کر رہی ہیں، وہاں اسلام اپنی فطری سادگی، آسانی اور نرمی کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے،

گب کو غم تھا کہ مغرب زدگی سے اس وقت سارا عالم اسلام متاثر ہے لیکن اب مغربیت

کا یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے، مسلمانوں کو اپنی متاعِ گم گشتہ کا احساس ہو چلا ہے، وہ اپنے اولین سرچشموں کے آبِ نشاط انگیز کی افادیت سے باخبر ہو رہے ہیں، وہ اپنی زندگی میں شریعت کے نظام کو پھر سے جاری و ساری رکھنا چاہتے ہیں، اقتصادیات، سیاسیات، سماجیات کے میدانوں میں اسلام کا جوہر کھل رہا ہے، گو خود شناسی کا یہ جوہر بعد از خرابیِ بسیار آشکارا ہوا ہے،

مارگولیوتھ جب اسلام کے بارہ میں گفتگو کرتے تو وہ ایک سیاسی مورخ بریگ کا یہ قول بار بار دہراتے، کہ اسلام کی زندگی اب صرف دو صدی اور ہے، اور مسلمانوں کی انتہائی تعداد دو کروڑ سے زیادہ نہ ہو سکے گی، لیکن آج مستند اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک ارب تک پہونچ چکی ہے، اور اسلام کی وسعت اور فروغ کا عالم یہ ہے کہ وہ استعمار کے گھر اور اس کی توپوں کے پیچھے یورپ تک جا پہونچا ہے، امریکہ میں وہ ایک مانوس حقیقت ہے، اور پانچوں براعظموں میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کسی نہ کسی مینارہ سے اللہ اکبر کی صدائیں نہ بلند ہوتی ہوں، یہی وجہ ہے مارگیولیوتھ نے بعد میں کہا کہ یہ کہنا کہ اسلام جلد ہی ختم ہو جائے گا، غور طلب مسئلہ ہے، اسلام روئے زمین پر ایک زندہ حقیقت ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانیت روز بروز سائنس کی مدد سے اپنے رب کو پہچان رہی ہے، اور سارے وہموں اور غلط تعبیروں کو ختم کرتی جاتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام بڑی سیاسی اور فوجی حکومتوں کے اثر و نفوذ سے آزاد ہوتا جا رہا ہے، اور ان حکومتوں کے اقتصادی اور ثقافتی اثرات سے نبرد آزما ہے،

مستشرق لانس کا خیال تھا کہ خلافت اسلامیہ کے سقوط کے اثرات یقینی طور پر اسلام کے مستقبل پر پڑیں گے لیکن حالات نے دوسرا ہی رخ دکھایا، مسلمانوں نے سقوطِ خلافت کے

بعد وحدت کی بنیادیں پھر سے استوار کیں، مسلمانوں کے مسائل کو متفقہ طور پر حل کرنے کے لئے اجتماعات اور مشاورتی جلسے منعقد ہوتے رہے، خصیصہ مستی ہم آہنگی سے ان مفروضوں کو غلط ٹھہرایا، جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وطنی تحریکیں، محدود قومیتیں، اور نسلی تفریقیں مسلمانوں کی فکری وحدت کا خاتمہ کر دیں گی، اور ان کے عقائد اور اُن کی ثقافت کو قصۂ پارینہ بنا دیں گی، اس عرصہ میں عرب قوم پرستی، فرعونی تہذیب کا احیاء اور فینیقیت جیسے وقتی رجحانات ابھرے ضرور لیکن مسلمانوں کا اسلام پر اعتقاد ایسا راسخ رہا کہ یہ رجحانات زیادہ موثر نہ ہو سکے،

موجودہ دور میں مسلمانوں کی آبادی میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عددی تفوق مستقبل میں مسلمانوں کی طاقت میں بہت موثر ثابت ہوگا،

اسی طرح مغربی اور لا مذہبی اثرات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کے ساتھ اب قرآن کی تعلیم از سر نو عام ہو رہی ہے، اور مسلمان بجا طور پر یہ یقین کرنے لگے ہیں، کہ عالم اسلام کی ترقی اور کامرانی صرف ایسی شریعت کے زیر سایہ ممکن ہے جس میں علم، دین، روح، مادہ دنیا اور آخرت کی جامعیت ہو،

مستشرقین کی نسبت سے اسلام کے بارہ میں یہ ایک عمومی جائزہ تھا، اب ہم پہلے قرآن کریم اور مستشرقین سے متعلق علاحدہ گفتگو کریں گے،

مستشرقین اور قرآن کریم اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ خصومت اور انکار کا ہے، اور یہی سلوک ان مستشرقین کا قرآن کریم سے ہے، اور جو ان مستشرقین کی فطرت کا عین غماز ہے، کیونکہ قرآن کریم، موجودہ توریت و انجیل کے متعلق صاف کہتا ہے کہ یہ دونوں تحریف شدہ کتابیں ہیں، اور یہ وہ نہیں ہیں جنکو . . . . خدا تعالیٰ نے آسمان سے اتارا تھا، قرآن نے موجودہ توریت و انجیل کی پیش کردہ خرافات کی صحیح نقاب کشائی کی، عقیدۂ توحید سے متعلق قرآن نے صراحت سے کہا کہ توحید ہی دین حق کی روح ہے. عقیدۂ تعدد الٰہ اور عقیدۂ تثلیث اس روح کے منافی عقائد ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں قرآن نے کہا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے، خدا نہ تھے، عیسائیوں کے عقیدہ کے برخلاف ان کو نہ قتل کیا گیا، نہ سولی دی گئی، بلکہ انھیں آسمان پر اٹھا لیا گیا، قرآن نے اس مضحکہ خیز عقیدہ کی بھی تردید کی کہ حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہو کر ساری قوم کے لئے نجات کا سامان فراہم کر دیا، قرآن نے اس تصور کو بھی باطل قرار دیا کہ کوئی خاص قوم خدا کی محبوب قوم ہے، ان کے علاوہ دوسرے کئی متنازعہ مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن نے قطعیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت داؤد، حضرت لوط علیہم السلام جیسے انبیائے معصومین سے متعلق توریت و انجیل میں بہت سی روایتیں ایسی داخل کر دی گئی تھیں، جن سے ان انبیائے معصومین کا مرتبۂ نبوت فرو تر نظر آتا تھا، قرآن نے ان روایتوں کو باطل ٹھہرایا، قرآن کریم کی اس صدق بیانی کو مستشرقین کیسے گوارا کر سکتے ہیں، چنانچہ ان مستشرقین کی کتابوں میں اس خیال پر عام اتفاق ہے کہ قرآن کا سرچشمہ وحی الٰہی نہیں، بلکہ وہ حضرت محمدؐ کا اپنا کارنامہ ہے، مستشرقین کے دوسرے دعووں کی طرح یہ دعویٰ بھی بے دلیل اور بے سند ہے، اس دعویٰ کی تہ میں یا تو قرآن دشمنی کا جذبہ کارفرما ہے، یا پھر وہ وحی کی فہم سے ناآشنا ہیں، یا ان کے پیمانے ایسے لوگوں کے قائم کردہ ہیں، جو صرف مادی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انجیل کے بارہ میں ان کا اعتقاد ہے کہ وہ کلام الٰہی نہیں، بلکہ نتیجۂ فکر بشر ہے، اسی لئے وہ قرآن کو بھی اسی حیثیت سے جانچتے ہیں، قرآن کا کلام الٰہی ہونا ان مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ بار بار اس سے متعلق اپنے شکوک و شبہات کی تکرار کرتے رہتے ہیں، اس شک کا اظہار اس کثرت سے ہوا کہ طٰہٰ حسین اور زکی مبارک وغیرہ جیسے عربی انشا پردازوں

دانشور بھی اس سے کسی حد تک متاثر ہوگئے،

قرآن کریم کے مضامین اور خاص طور سے قرآنی قصوں کے بارہ میں ان مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ نبی کریمؐ مکہ میں عیسائی اور یہودی علماء سے ربط ضبط رکھتے تھے اُن سے یہ قصے سن کر آپ نے اُن کو قرآن میں پیش کر دیا لیکن مستشرقین کے اس شبہ کا ازالہ اسی وقت ہوجاتا ہے جب توریت وانجیل کے روایت کردہ افسانوں اور قرآن کے پیش کردہ قصوں کا موازنہ کیا جاتا ہے، قرآنی اسلوب، بلاغت وحکمت کے اعلیٰ معیار اور وسیع دقیق معلومات کی بدولت یہ بات خود بخود ظاہر ہوجاتی ہے کہ کلام ربانی اور کلام انسانی میں کس قدر فرق ہے، صدق مقالی، عبرت خیزی، سادگی وپرکاری، حکمت ودانائی، افسانوی تفصیلات سے دوری، اور ایک مرتب ہم آہنگی قرآنی امتیازات ہیں، اور یہ وہ اسلوب ہے جس کے ذریعہ عالم انسانیت، سلامت فکر کے نئے دور اور ایک زندہ وپائندہ پیغام کے عہد میں داخل ہوا، لیکن اس کے ادراک کے لئے نگاہ بصیرت کی ضرورت ہے، مستشرقین کا اعتراض کوئی نئی بات نہیں، ہر دور میں، اسلام کے دشمنوں کی زبان سے ایسے ہی کلمات سرزد ہوئے، نبی کریمؐ کے دور میں مشرکین مکہ کا الزام بھی تھا کہ آپ نے یہ حکایتیں، مکہ میں مقیم ایک غیر عرب زبان داں سے سُن کر بیان کی ہیں،

مستشرقین میں گولڈ زیہر اور ام بلیشر نے انہی اندیشوں کا اظہار کیا کہ نبی کریمؐ نے شام کے سفر میں عہد نامۂ عتیق کی روایتیں سنیں، اور پھر ان کو قرآن میں دہرا دیا گولڈ زیہر اور نولدکی نے یہ بھی دعوی کیا کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد قرآن میں تحریف کی گئی وہ مثال دیتے ہیں کہ آپ کا نام قثم یا قثامہ تھا، لیکن جب آیت ومبشراً برسول یاتی من بعدہ اسمہ احمد (اور خوش خبری دینے والے ایک ایسے پیغمبر کی جو ان کے بعد آئے گا اس کا

نام احمد ہوگا) اتری تو آیت کو منطبق کرنے کے لئے آپ کا نام بدل دیا گیا اور بجائے قثم کے محمد نام رکھا گیا، اس تحقیق انیق کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ آپ کے بہت سے صفاتی نام ہیں آپ کے دادا عبدالمطلب نے محمد نام رکھنے سے پہلے قثم نام تجویز کیا تھا، اس روایت کو ان مستشرقین نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا،

حالت وحی میں نبی کریمؐ کے چہرۂ مبارک سے گرانباری اور شدت کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا، مستشرقین نے اپنی تحقیق کے ذریعہ اس کیفیت کو نعوذ باللہ مرگی کے دورے سے تعبیر کیا، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ اپنا ہوش کھو بیٹھتے تھے، پسینہ جاری ہوجاتا، تشنج کیفیت طاری ہوتی، منھ سے جھاگ نکلنے لگتا، اور جب آپ کو افاقہ ہوتا، تو آپ فرماتے کہ مجھ پر وحی آئی تھی، اور پھر آپ اپنے اصحاب کے سامنے آیات قرآنی تلاوت کرتے، رسول اللہؐ کی بشری حالت میں حضرت جبرئیل کے ملکوتی وجود سے ہم دمی وہم رازی، اور اظہار وحی ایسے اہم مسائل میں سے ہیں، جن کے بارہ میں علماء ومحققین نے داد تحقیق دی اور جس کے صحیح ادراک سے مادی علم وفہم عاجز وقاصر ہیں، لیکن مستشرقین کی تحریروں میں تعصب، عیب جوئی اور الزام تراشی کی کارفرمائی کے بعد یہ تحقیق تنگ تحقیق بن جاتی ہے، جس پر ناطقہ سر بگریباں ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا،

قرآن کی بعض سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے، مستشرقین نے یہاں بھی داد تحقیق دی ہے، نولدکی اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی نے قرآن کے متعدد نسخوں کو ایک مصحف میں جمع کرنا چاہا، اس سلسلہ میں قرآن کے متعدد نسخوں کے مالکوں سے انھوں نے مدد لی، چنانچہ یہ حروف مقطعات، ان مالکوں کے مخفف نام ہیں، یہ تحقیق بعید از قیاس بلکہ مضحک ہے،

ایک مستشرق ایڈورڈ جونسن کا خیال ہے کہ یہ حروف مقطعات سورتوں کے

قدیم ناموں کا اختصار ہیں، یہ خیال یوں خام نظر آتا ہے، کہ اگر حروف سورتوں کے نام ہوتے تو ان کو بسم اللہ سے پہلے لکھا جاتا، نہ کہ بعد میں، اور اگر ایسا ہوتا، تو قدیم مفسرین کو اس کا علم ضرور ہوتا، اور وہ اس کی جانب اشارہ کرتے، اصل بات یہاں بھی وہی ہے کہ مقصد علمی موشگافی نہیں ہے، صرف ثابت یہ کرنا ہے کہ یہ حروف مقطعات، وحی کے کلمات نہیں ہیں، بلکہ ان کو نبی کریمؐ کے بعد قرآن میں داخل کیا گیا ہے، حالانکہ یہ حروف نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، اور آپ نے اُن کو اصل قرآن میں ہی شمار کیا۔

مستشرق لوئیس جارڈیہ اور پادری قنواتی نے اپنی کتاب فلسفۃ الفکر الدینی بین المسیحیۃ والاسلام میں یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کی ترتیب اور سورتوں اور آیتوں کی تقسیم حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ہوئی، حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب نبی کریمؐ کے عہد ہی میں مکمل ہو چکی تھی، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک مختلف لوگوں کے پاس نامکمل مصاحف موجود تھے، حضرت عثمانؓ کے دور میں صرف یہ ہوا کہ ان نامکمل مصحفوں کے بجائے قرآن کے مصحف کامل کا رواج عام ہوا،

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی موجودہ اور اصل ترتیب سے ہٹ کر اپنے طور پر ایک نئی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی، ان مستشرقین میں ولیم موبیر، ویل، روڈویل وغیرہ کے نام آتے ہیں، لیکن ظاہر کہ یہ سعی لاحاصل تھی، چنانچہ کچھ حاصل نہ ہوا، بعض مستشرقین نے چند ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی بنیاد پر قرآن کی زبان میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا کہ بعض صحابۂ کرام کو قرآن کریم کے بعض جملوں کی ساخت و ترکیب سے اتفاق نہیں تھا، لیکن مستشرقین کی اس کوشش کو طفلانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں سمجھا گیا،

۴۔ مستشرقین نے زبان و بیان کی غلطیاں دکھانے کے بعد معنوی اعتبار سے بھی

قرآن کا مرتبہ کم ثابت کرنے کی کوشش کی، ان کا خیال ہے کہ قرآن کوئی مکمل نظام نہیں ہے، اصلاح معاشرہ کی ایک وقتی کوشش ہے، نبی کریمؐ نے اپنی قوم کے طبقاتی نظام کی خرابیوں کو دیکھا تو اس کی جانب اس قرآن میں توجہ دلائی، اسی لئے آپ نے روز قیامت کے خوف کو نمایاں کیا، کم تولنے اور ناپنے والوں سے متعلق، اور یتیم پر ظلم ڈھانے سے متعلق اور سائل کو دھتکارنے اور ڈانٹنے کے بارہ میں آیتیں پیش کیں، گویا قرآن بجائے ایک ضابطۂ حیات کے صرف وقتی مسائل کے حل کرنے کی حد تک محدود تھا، حالانکہ ہر غیر متعصب اور انصاف پسند انسان قرآن کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا، کہ قرآن کی صورت میں خدائے تعالیٰ نے ایک مکمل و جامع، ضابطۂ حیات پیش کر دیا ہے، جو ہر زمان اور ہر مکان کے لئے سامان ہدایت ہے، خواہ حالات اور واقعات کتنے رنگ بدلیں، قرآن کی تعلیمات کی جامعیت ہمیشہ موثر رہے گی، قرآن کی یہ جامعیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کوئی انسانی کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ ذات ربانی ہے،

مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ نبی کریمؐ یہودی اور نصرانی عالموں کی تعلیمات سے متاثر ہوگئے تھے، (حالانکہ نبی کریمؐ کا امی ہونا ہی اس دعویٰ کی تردید کرتا ہے)، لیکن قرآن کے نظام حیات، معرفتِ کائنات، قوانینِ فطرت، تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب جیسے قرآنی مضامین کی ایک جھلک بھی توریت و انجیل میں نہیں پائی جاتی، حد تو یہ ہے کہ اولین مسئلہ یعنی مسئلۂ توحید ہی میں ان کے درمیان شدید اختلاف ہے، لیکن مستشرقین پھر بھی یہی دہراتے جاتے ہیں، کہ نبی کریمؐ کی تعلیمات کے اصل ماخذ یہودی اور عیسائی علماء تھے،

۵۔ قرآن پر ایک اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب میں سجع اور قوافی کا پابند ہے

لوئی ماسینیوں ایسے ہی مستشرقین کی نمایندگی کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے متعدد اسالیب ہیں، ان میں سے ایک سجع کا اسلوب بھی ہے، مگر یہ عام سجع سے منفرد اور انتہائی اثر آفریں ہے، اور کاہنوں کے سجع سے بالکل جدا اور کہیں برتر ہے، اسی لیے ایک اہلِ زبان نے کہا تھا، کہ بخدا یہ قرآن نہ تو شعر ہے، نہ سحر ہے، اور نہ ہی عمل کہانت ہے، یہ تو کچھ اور ہی شے ہے،

مغربی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ تاریخ اس سوال کا دلچسپ جواب پیش کرتی ہے، صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد جب عیسائی فوجی اپنے وطن میں واپس آئے تو اپنے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک اسلام کی تہذیب اور اس کی خوبیوں کی داستانیں بھی ساتھ لائے، چنانچہ یورپ میں اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کے بجائے قربت اور دوستی کا سازگار ماحول بننا شروع ہو گیا، اس نئی رائے عامہ سے اربابِ اقتدار کا پریشان ہونا فطری امر تھا، چنانچہ لوئس نہم کی تجویز یہ ہوئی کہ قرآن کریم اور اس کی تشریح اس انداز سے کی جائے جو صاحبِ قرآن کی تکذیب اور خود قرآن کی سلامتی و عظمت میں شکوک پیدا کر دے، ایک محقق کے قول کے مطابق صلیبی جنگوں کے بعد اربابِ کلیسا نے یہ تلخ حقیقت محسوس کی کہ ان جنگوں کے بعد نہ تو عیسائیوں کو ارضِ مقدس پر کامل فتح نصیب ہوئی، اور نہ مسلمانوں نے مسیحیت کو گلے لگایا، بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب اور طرزِ معاشرت نے صلیبیوں پر قابلِ لحاظ اثر چھوڑا، اور اسی وقت سے یہ منصوبے بننا شروع ہو گئے، کہ اسلام کا مقابلہ میدانِ جنگ کے بجائے فکر و نظر کے میدان میں کیا جائے، جو زیادہ بامقصد اور کارآمد ثابت ہوگا، اس سلسلہ میں اولین نام ایک صاحب طبری (۱۱۶۵ء) کا آتا ہے، ان کو اسپین بھیجا گیا، انھوں نے

وہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی آویزش اور مناظروں کا بغور جائزہ لیا، اور اسپین کے ان عیسائیوں کے طریق کار سے بھی واقف ہوئے، جن کا خیال تھا کہ اسلام کا مقابلہ صرف عقلی اور منطقی دلائل سے ہی کیا جا سکتا ہے، عیسائیوں کی ان کوششوں کا ثمرہ اس وقت حاصل ہوا، جب لاطینی زبان میں قرآن کا ترجمہ مکمل ہوا، اس ترجمہ کا پہلا اڈیشن باجاتی نے ۱۵۳۰ء میں بندقیہ سے شائع کیا، لیکن اس وقت کے پوپ پال سوم نے اس کے تمام نسخے جلوا دیئے، اس کے بعد پوپ الیکزنڈر چہارم نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ قرآن اور اس کے ترجمہ کی اشاعت ممنوع قرار دی، ۱۶۹۴ء میں ایک جرمن بشپ ابراہام ہنکلمان نے قرآن کا ترجمہ شائع کیا، گو یہ ترجمہ ۱۶۶۶ء میں تیار ہو چکا تھا لیکن اس وقت اس کو شائع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، اپنے اس ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ اگر ہم اسلام کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اس کے بعد ہی مشرق میں دینِ مسیحی کے فروغ کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں، گویا قرآن کا مطالعہ اور اس کے علوم کی معرفت حاصل کرنے کی نیت روزِ اول سے یہ تھی کہ اسلام کا مقابلہ کیسے کیا جائے، اور اس کی تعلیمات کو کن کن طریقوں سے باطل ٹھہرایا جائے، خشتِ اول کی اس کجی کے بعد پوری عمارت کے ناقص ہونے پر اس کے بعد زیادہ تعجب نہیں ہوتا، تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب مستشرقین اپنے مطالعہ کو معروضی، تحقیقی، اور خالص علمی ہونے کا نام دیتے ہیں، ان مستشرقین نے اپنے علمی کاموں یا کارناموں میں اپنے اسلاف کے طریقہ کو راہ نما بنایا، اور ان سب کی تحقیقات کا ماحصل یہ رہا کہ قرآن کریم یا تو نصرانیت سے ماخوذ ہے یا یہودی تعلیمات سے نبی کریمؐ نے استفادہ کیا ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے لفظ محمد کی تشریح میں ان ہی خیالات کو جگہ دی ہے،

تاریخ کی بحث میں ٹائن بی نے ایسے ہی مفروضات کو داخل کیا، اور واٹ، جارج اور لوری وغیرہ سارے مستشرقین کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف ہے اور اس کے مصادر و مراجع توریت و انجیل ہیں، سارے مستشرقین کا ایک نتیجہ پر متفق ہو جانا محض اتفاقی بات نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ وہ تعصب اور نفسانی خواہشات میں متفق ہیں، اس کے بعد کسی علمی مسئلہ کے کسی آزادانہ اظہار رائے کی توقع ہی کیوں کر کی جا سکتی ہے، محمد اسد کے قول کے مطابق مستشرقین کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام ایک علمی مباحثہ کا موضوع بننے کا اہل ہی نہیں، بلکہ وہ ایک مجرم ہے، اور اپنے منصفوں کے سامنے فیصلہ کے لئے دست بستہ کھڑا ہے،

مستشرقین کے اعتراضات کا جواب مسلمان اہل قلم نے بار بار دیا ہے کہ اگر قرآن نے توریت و انجیل سے استفادہ کیا ہوتا تو سب سے پہلے یہود ہی اس کا اعتراف کرتے اور قرآن کو تسلیم کرتے، لیکن یہود تو کسی نبی اور پیغمبر کے نہ ہوئے، سب کے ساتھ ان کا رویہ بغض و کینہ اور خبث باطن کا رہا، نبی کریمؐ کی مخالفت میں بھی انھوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازباز کی، مقصد یہی تھا کہ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے پر طعن و طنز کا موقع ملے اگر توریت و انجیل کی تعلیمات قرآن نے پیش کی ہوتیں تو یہودیوں کو تو سب سے پہلے قرآن کو تسلیم کرنا چاہئے تھا، مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں چند مغربی اہل قلم مثلاً ارنلڈ نے بھی اظہار خیال کیا ہے، وہ اپنی کتاب الاسلام والمسیحیۃ الحقیقیۃ میں لکھتے ہیں، کہ انجیل کے صحیفوں میں جس عقیدہ اور دینی نظام کو پیش کیا گیا ہے، اسے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات قرار نہیں دیا جا سکتا، آج مسیحیت اور اسلام کے درمیان موجود نزاع کا تعلق حضرت عیسیٰ

کی انجیل سے نہیں بلکہ پال کی انجیل سے ہے جس نے انجیل کی غلط تشریح کی، اور متضاد قصوں اور افسانوں کو باہم خلط ملط کر دیا، اس کے علاوہ انجیل میں اسلوب کے لحاظ سے بھی بنیادی اختلاف موجود ہے، کیونکہ انجیل کے صحیفوں لوقا، متی، یوحنا، مرقس اور برنابا کے کاتب الگ الگ ہیں، اس لئے یہ قرآن معنی اور اسلوب دونوں طرح سے توریت و انجیل سے ممتاز ہے،

(مستشرقین کے نام عربی میں جس طرح لکھے گئے، اسی طرح اس ترجمہ میں لکھ دیئے گئے ہیں)

(باقی)

دار المصنفین کی بعض عربی مطبوعات

الانتقاد علی التمدن الاسلامی:- مصر کے مشہور مورخ و صحافی اور الہلال مصر کے اڈیٹر جرجی زیدان کے سلسلۂ تاریخ تمدن اسلامی پر مولانا شبلی کے قلم سے عربی میں تنقید،

الجزیہ — تنگ نظر ہندو مورخین کے جزیہ پر اعتراض کا جواب، قیمت

بدء الاسلام — مولانا شبلیؒ کے زمانۂ قیام علی گڑھ کا سیرت پر عربی میں ایک مختصر رسالہ،

الرسالۃ المحمدیہ — مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات مدراس کا عربی میں ترجمہ،

دروس الادب جزء اول
" " جزء ثانی — عربی کے ابتدائی درجوں کے لئے صرف و نحو میں دو ریڈریں، قیمت ۲ و ۳ روپیہ

لغات جدیدہ (زیر طبع) — جدید عربی کے نئے الفاظ کی مکمل ڈکشنری (مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی)

"منیجر"

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا علمی کارنامہ

از

پروفیسر عبدالمغنی شعبۂ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی

علامہ سید سلیمان ندویؒ غیر منقسم ہندوستان کے اُن معدودے چند عظیم ترین علمائے کرام میں ایک تھے جنھوں نے عصر حاضر کی علمی زندگی پر اپنا نقش دوام ثبت کیا ہے۔ شبلی، حالی، سرسید اور نذیر احمد کے بعد جن چار اہم ترین علماء نے دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا وہ یہ ہیں: علامہ اقبال، علامہ ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ ابوالاعلیٰ مودودی، ان چاروں نے اپنا امتیاز وقت کے بہت بڑے بڑے ان علماء کے درمیان قائم کیا جو ہندوستان کے اندر اور باہر اپنی بصیرت اور خدمت کے لیے نمایاں ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پورے پورے ادارے کا کام کیا، نئی نسلوں کو متاثر کیا اور ایک ذہنی فضا قائم کی، ان کے پیش روؤں میں شبلی اور سرسید نے انیسویں صدی کے اواخر میں ملک و ملت پر مغربی علوم کے بڑھتے ہوئے تسلط کا زبردست مقابلہ کیا تھا اور مشرقی تہذیب کے خلاف مستشرقین کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے میں بڑی مؤثر کوشش کی تھی، خاص کر شبلی نے اپنے علمی کارناموں سے ثابت کر دیا تھا کہ اہل مغرب تاریخ کے مطالعہ میں کم علم بھی ہیں اور بد دیانت بھی، لہٰذا اہل مشرق کو ان سے مرعوب ہونے کے بجائے محنت و قابلیت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے، اسی مقصد کے لیے شبلی نے دارالمصنفین کا خاکہ مرتب کیا اور ندوۃ العلماء کی تشکیل کی، لیکن تحقیق و تصنیف کی جو شاہراہ انھوں نے روشن کی تو اس کی

تعبیر مکمل کرنے کا انھیں موقع ملا اور نہ وہ اس پر کوئی کارواں لے کر چل سکے، ان کی وفات نے ان کے منصوبوں کو صرف ایک خوش آیند خواب بنا دیا، یہ خواب اقبال نے بھی اپنے طور پر دیکھا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ شبلی اس میں رنگ بھریں، مگر ان کی موت نے اس خواب کو ادھورا چھوڑ دیا، ابوالکلام آزاد کے اپنے علمی اجتہادات کے خواب بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی کی مشغولیتوں کے سبب بکھر گئے، ابوالاعلیٰ مودودی بھی افق پر ابھرے نہ تھے۔

چنانچہ بقول اقبال جوئے اسلام کے جس فرہاد نے شبلی، اقبال اور ابوالکلام آزاد سبھی کے خوابوں کی تعبیر نکالی اور اس کو پورا کرنے کے لیے تحقیق و تصنیف کی ایک شاہراہ تعمیر کی، نیز اس پر گامزن ہونے کے لیے ایک پورا قافلہ مرتب کیا اور اس کو منزل کی طرف رواں دواں کر دیا، اس کا نام سید سلیمان ندوی ہے، اس فرہاد علم و تحقیق نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کو پروان چڑھایا، اور ندوۃ العلماء کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا، دارالمصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ "معارف" جاری کیا، سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کی، سیرت عائشہؓ مرتب کی، عرب و ہند کے تعلقات کا سراغ لگایا، خطبات مدراس دیے، نقوش سلیمانی تحریر کیے، عمر خیام کی حقیقت و اہمیت واضح کی اور تاریخ اسلام سے لیکر سیر الصحابہ اور بزم صوفیہ تک تصنیف کرائی، اس کے علاوہ سید سلیمان ندویؒ نے وفد خلافت سے عالم اسلامی تک بین الاقوامی اور بین الملّی سطح پر ملک و ملت کی یادگار خدمات انجام دیں، واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل کے ہندوستان میں سید صاحب کے زیر قیادت ادارے علمائے وقت کے مراکز بن گئے اور علمی و تحقیقی کاموں کے لیے ان کے تمام ہمعصر علماء: اقبال، ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ نے ان اداروں کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا۔

سیرۃ النبیؐ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جس کی سات عظیم الشان جلدوں میں پانچ ان کی لکھی ہوئی ہیں، اس کتاب میں پہلی بار دنیا کی کسی زبان میں سیرت رسولؐ کے موضوع پر تمام ضروری مضامین و مضمرات کا احاطہ جدید ترین معلومات کی روشنی میں کیا گیا، چنانچہ سیرت پر کوئی اتنی جامع کتاب

آج تک نہ تو اس سے قبل تحریر کی گئی نہ اس کے بعد۔ یہی وہ تاریخی دستاویز ہے جس کے ذریعہ مستشرقین کہلانے والے علمائے مغرب کی ان جہالتوں کا پردہ چاک کر دیا گیا جو وہ سیرت رسولؐ پر اپنے متعصبانہ حملوں میں ظاہر کرتے رہتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے ذریعہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسلام کے اس نظام حیات کا مکمل نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی جو شارع اسلامؐ نے خود اپنی زندگی میں احکام وحی کے تحت مرتب کر دیا تھا اور اس کے ہر پہلو پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا، سیرۃ النبیؐ میں قرآن و حدیث کے علاوہ سیرت کے تمام قدیم ماخذ کا عطر پیش کر دیا گیا اور اس سلسلہ میں جدید مباحث کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، اب یہ کتاب بجائے خود سیرت نبویؐ کا ایک اہم ترین ماخذ بن گئی ہے اور سیرت پر کوئی علمی کام اس سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جا سکتا، واقعہ یہ ہے کہ اس ایک کتاب نے اپنے مواد و اثر دونوں سے سیرت کی بے شمار کتابیں اور مضامین و مقالات پیدا کر دیے، نیز لا تعداد خطیبوں کو مستند مقرر بنا دیا، پوری دنیا میں اس کتاب کے علمی معیار و وقار کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم کی کوششیں کی گئی ہیں جو ابھی تک شاید کتاب کے وزن و حجم کے سبب جزوی ہی طور پر کامیاب ہو سکی ہیں، کتاب کے مباحث سید صاحب کو بیک وقت سیرت نگار، محدث، مفسر، فقیہ، متکلم اور ادیب کی اعلیٰ حیثیتوں میں پیش کرتے ہیں۔

سیرت نبویؐ کے ساتھ اسی شغف نے علامہ سید سلیمان ندویؒ سے تین اور زبردست علمی کام کرائے، جن میں ایک "ارض القرآن" ہے، جو دراصل سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ کے طور پر ایک مبسوط مقالہ کی شکل میں تصنیف کی گئی تھی اور اس میں قرآن حکیم کی تاریخی و جغرافیائی تفسیر کے طور پر ان مقامات و اقوام کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جن کا ذکر اور حوالہ قرآن کریم میں آیا ہے اس کا کچھ حصہ سیرۃ النبیؐ میں شامل کیا گیا، پھر پورے مواد کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ ایک مستقل کتاب کی صورت دے دی گئی، اس طرح ایک دوسری کتاب کے مقدمہ سے بڑھ کر جو چیز بجائے خود ایک مستقل کتاب بن گئی وہ قرآن کے مباحث اور شارع اسلامؐ کی

سیرت کا مکمل جغرافیائی و تاریخی پس منظر پیش کرتی ہے اور اس کے مطالعہ سے آشکارا ہوتا ہے کہ اصولی طور پر کتاب اللہ میں اور عملی طور پر سنت رسولؐ کے نمونہ میں نظام اسلام کا جو بنیادی خاکہ مرتب ہوا وہ تاریخ کے کن احوال اور روئے زمین کے کن مقامات کے پس منظر میں رونما ہوا، یہ کتاب ابھی تک اپنے موضوع پر سب سے اہم علمی تصنیف ہے اور اس سے بہتر کوئی تصنیف دنیا کی کسی زبان میں مرتب نہیں ہوئی ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری چیز "خطبات مدراس" ہے جس میں سیرت رسولؐ کی جامعیت کو بڑے جامع مختصر اور دلنشین انداز میں نمایاں کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب سیرت رسولؐ کا عطر ہے اور صد درجہ موثر ہے، سیرت کے موضوع پر یہ عالمانہ و محققانہ خطبات اپنے مواد و انداز دونوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں، مساجد کے منبروں اور جلسہ سیرت کی محفلوں میں ان خطبات کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے، نئی نسلوں نے سیرت اور سنجیدہ خطبات کے کتنے ہی سبق ان خطبات سے لیے، کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب سیرت رسولؐ کا بہترین خلاصہ پیش کرتی ہے۔

تیسری سیرت رسولؐ جو سید صاحبؒ کے قلم سے نکلی، رحمت عالمؐ ہے، جو نوجوانوں اور عام طالب علموں کے لیے مختصر پیمانے پر اور سادہ انداز میں تحریر کی گئی ہے، یہ کتاب متعدد درسگاہوں کے نصاب میں داخل رہی ہے، یہ اپنے موضوع پر سب سے آسان اور عام فہم تصنیف ہے، جس کا مطالعہ کر کے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سیرت رسولؐ کی مستند واقفیت حاصل کر سکتا ہے، اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی سنوار سکتا ہے۔

سیرت عائشہؓ اپنے موضوع پر ایک نادر تصنیف ہے، جس میں ام المومنین کی زبردست شخصیت کا مکمل و موثر خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی مثالی عورت کیا اور کیسی ہو سکتی ہے، اور کس طرح وہ پردے کی شرعی حدود میں رہتے ہوئے سماج کی بہترین علمی و عملی خدمات انجام دے سکتی ہے، نیز بحیثیت عورت اپنی شخصیت کے تمام امکانات کو بروئے عمل لا سکتی ہے، یہ کتاب بھی

اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہے اور اپنے موضوع کے جدید و قدیم مآخذ کا احاطہ کرتی ہے، اس کے صفحات میں رسول کریم ﷺ کے اہلبیت کا ایک مستند نقشہ ملتا ہے اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی پاکیزہ خلوت کا ایمان افروز جلوہ نظر آتا ہے۔

اسلام کی ان خالص دینی خدمات کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ملت اسلامیہ کی تاریخ اور مسلمانوں کے کارناموں کی تحقیق سے بھی اعلیٰ درجہ شغف رکھتے تھے، اس سلسلہ میں متعصب انگریز مورخین اور ان کے مقلد فرقہ پرست ہندو تاریخ نویسوں کی طرف سے آئے دن جو فتنے جاہلانہ و وحشیانہ انداز میں اٹھائے جاتے تھے، ان کا مسکت و موثر جواب دینے کے لیے سید صاحب کے زیر قیادت پورا دارالمصنفین اور اس کا رسالہ معارف تو سرگرم تھا ہی، خود سید صاحبؒ نے ایک بہت ہی وسیع اور اہم موضوع "عرب و ہند کے تعلقات" کو ایک مبسوط محققانہ تصنیف کے لیے منتخب کیا اور اپنی معلومات و دلائل سے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تعلقات اس ملک پر مسلمانوں کی فوج کشی کے بہت قبل اور قدیم ترین ادوار سے تجارتی، ثقافتی اور علمی سطحوں پر رہے تھے، لہٰذا ہندوستان میں مسلمان اجنبی حملہ آوروں کی طرح نہیں داخل ہوئے نہ انھوں نے اپنے مفتوحین کے ساتھ جاہل وحشیوں جیسا سلوک کیا، بلکہ وہ اس ملک میں ایک ایسے زبردست تہذیبی و اصلاحی عنصر کی طرح داخل ہوئے، جس نے اپنی سیاسی و عسکری طاقت سے بھی زیادہ اپنے علمی و اخلاقی کمالات سے پورے ملکی سماج کی نشأۃ ثانیہ کا سامان کیا۔

عرب دنیا میں اسلام کے پیغام کے اولین علمبردار تھے اور انھوں نے آج کی نئی دنیا کی بنیاد رکھی تھی، دور جدید کے علوم و فنون کی بہتیری ایجادات و انکشافات کی راہیں عربوں نے ہی ہموار کی تھیں، انھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعہ مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ کر ملا دیں اور عہد وسطی میں سائنسی آلات کے ساتھ ساتھ مکمل نقشے بنا کر پوری دنیا کی سیر و سیاحت کی، نئی دنیاؤں کی دریافت میں واسکوڈی گاما اور کولمبس کی

پیش روی اور رہبری عربوں ہی نے کی، لیکن احسان فراموش اہل مغرب اپنے جاہلانہ تعصبات کی بنا پر عربوں کے ان کارناموں کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ انھیں دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے، تاکہ ایک طرف اپنی ذہنی برتری کا سکہ عالم انسانیت پر جمائے رکھیں، اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا رکھیں، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں ایک اہم موضوع "عربوں کی جہازرانی" پر صرف چار خطبات میں علمائے مغرب کے فریب کا پردہ چاک کر دیا، اور واضح کر دیا کہ عصر حاضر کی جہازرانی کے استاد اول عرب ہی ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دی، وہ خود عربی کے عالم اور ادا شناس تھے، انھوں نے اس زبان کی ترویج کے لیے ایک طرف "دروس الادب" لکھی جو عربی دانی کے ابتدائی نصاب کے طور پر درسگاہوں میں تجویز کی گئی، اور دوسری طرف ایک "لغات جدیدہ" کی تالیف کر کے جدید عربی صحافت و ادب کے تمام مروجہ الفاظ و محاورات و اصطلاحات کی تشریح کی، اس کے علاوہ اپنی نگرانی میں عربی رسالہ "الضیاء" کا اجراء کیا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے پہلی بار ہندوستان کے ساتھ عالم عربی کا براہ راست رابطہ قائم کرایا، اور مسعود عالم ندوی نیز ابوالحسن علی ندوی جیسے عربی کے ادیب پیدا کیے، مسعود عالم ندوی نے اپنے شاگردوں کے ذریعہ اور خود بھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اردو لٹریچر کا ترجمہ کر کے اسے عالم عربی کا مقبول ترین علمی اثاثہ بنا دیا، ابوالحسن علی ندوی کے عربی خطبات دنیائے عرب میں نشر ہوئے، اور ان کے بعض مضامین سے اقبال کے کلام و پیام کی تفہیم کا بھی کچھ کام عربی زبان میں ہوا۔

سید صاحبؒ فارسی ادب کا بھی نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے، اور اس زبان کے محاورات پر ان کی نظر اتنی گہری اور وسیع تھی کہ بعض وقت علامہ اقبالؒ جیسے فارسی کے عظیم ترین شاعر کو انھوں نے زبان و بیان کے بعض امور کی طرف متوجہ کیا اور اقبالؒ نے بہت خوش دلی اور احترام کے ساتھ اس سلسلہ میں سید صاحب

تبادلۂ خیال کیا، جس کا ثبوت مکاتیب اقبال میں موجود ہے، سب سے بڑھ کر عمر خیامؒ پر سید صاحبؒ کی معرکہ آرا کتاب عصر حاضر کے ہندوستان میں شعر العجم کے بعد فارسی تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اس کی بہت ہی شاندار پذیرائی ایران و افغانستان اور دوسرے ممالک کے فارسی داں طبقوں میں ہوئی، یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ نے یہ داد دی کہ خیام پر سید صاحب نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ ماضی میں خیام پر کی ہوئی تمام تحقیق و تنقید میں زبردست اضافہ ہے، بلکہ آئندہ بھی کوئی اضافہ خیام کے متعلق سید صاحبؒ کی تصنیف پر متوقع نہیں ہے، یہ نادر کتاب اس مقالہ پر مبنی ہے جو سید صاحب نے دسمبر ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں پیش کیا تھا، یہی وہ تصنیف ہے جس میں پہلی بار خیام کے بارے میں اہل علم مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرکے قطعی طور پر ثابت کر دیا گیا ہے کہ فارسی کا یہ مشہور ترین رباعی گو کوئی رند شاہد باز نہیں، اپنے وقت کا ایک عظیم فلسفی اسکالر اور سائنس داں تھا۔

اردو زبان و ادب کے تو سید صاحبؒ ایک عظیم محقق، عالم، ادیب اور خطیب تھے ہی، زبان کے سلسلہ میں ان کی تحقیق اور ادب پر ان کی تنقید کا اعلیٰ نمونہ ان کے مجموعۂ مضامین 'نقوش سلیمانی' میں موجود ہے، انھوں نے اردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما کے متعلق جو تحقیق کی ہے، وہ ان کو ایک اہم ماہر لسانیات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی کاوشوں کے حوالے لسانیات پر لکھنے والے دیتے رہتے ہیں، ادب پر ان کی دو تنقیدوں کی مثال ان کے ذوق کی پختگی اور ذہن کی رسائی پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے، جگر مراد آبادی کے کلام کی تحسین سید صاحبؒ نے اس وقت کی جب نیاز فتحپوری جیسے لوگ اس کی تنقیص کیا کرتے تھے، آج نیاز فتحپوری کو نقاد کی حیثیت سے جاننے اور ماننے والے خال خال ہی ہیں، جب کہ جگر کی جگہ شعرائے اردو کی صف اول میں محفوظ ہو چکی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح اصغر گونڈوی کی شاعرانہ اہمیت علامہ ابو الکلام آزاد نے اس وقت واضح کی جب کم لوگ ان کے مرتبہ شناس تھے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندوی نے جگر کی قدر شناسی اس وقت کی جب ناقدین ان کے مرتبہ کا

تعین نہ کر سکے تھے، دوسری مثال کلام شاد کے ایک مجموعہ پر سید صاحبؒ کا وہ معرکہ آرا تنقیدی مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے شاد کی شاعرانہ عظمت کی تعیین کرتے ہوئے دنیائے ادب میں پہلی بار دلی اور لکھنؤ کے مقابلہ میں عظیم آباد کے مکتب شاعری کی یہ خصوصیت واضح کی کہ اس میں لکھنؤ کی خارجیت اور دلی کی داخلیت کا متوازن امتزاج ہے، بعد میں بہار کے کئی ادیبوں اور ناقدوں نے سید صاحبؒ کے دریافت کردہ اس تنقیدی نکتے کی اشاعت اپنے متعدد مضامین میں اپنے طور پر کی، یہاں تک کہ جناب کلیم الدین احمد جیسے نکتہ چین اور عیب جو نقاد نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" میں شاد کو شاعر نہ تسلیم کرنے کے باوجود "کلیات شاد" کی ترتیب کر کے اس کے مبسوط مقدمہ میں خواہ غلط ہی طور پر سہی شاد کو میر و غالب کے ساتھ تثلیث تغزل کا ایک رکن قرار دے کر اپنی پچھلی تنقیدی غلطی کا [illegible] کر لیا۔

زبان کے مسئلہ پر سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندویؒ ہی نے مارچ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی انجمن اردوئے معلیٰ کے جلسہ میں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ پڑھ کر واضح کیا کہ اردو کا صحیح نام "ہندوستانی" ہونا چاہیے جو سولہویں صدی عیسوی سے تاریخوں میں اردو کے لیے مستعمل بھی ہے اور یہی لفظ پورے ہندوستان کی حقیقی قومی زبان کی حیثیت سے اردو کا صحیح اور موزوں نام بھی ہے، (اس سے بہت قبل ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس مسئلہ پر اظہار خیال کر چکے تھے) اس تجویز نے ہندی کے اردو دشمن فرقہ پرستوں کے قدموں تلے سے زمین نکال لی اور انھوں نے بڑی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے بالکل ناجائز طور پر "ہندی، اکھوا ہندوستانی" کی رٹ لگانی شروع کر دی، بعد میں جب عبد الحق راجیندر پیکٹ کے ذریعہ ۱۹۳۸ء میں زبان کے قومی مسئلہ کا حل پٹنہ میں ایک میثاق پر فریقین کے دستخط سے نکالا گیا تو پورے ملک کی قومی زبان کا نام "ہندوستانی" رکھا گیا اور اس کے لیے اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط تجویز کیے گئے۔

ہندوستان کی تاریخ اور ملک میں تعلیم کے مسائل پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کاوشیں بے حد اہم ہیں، انھوں نے تاریخ ہند کا ایک مکمل خاکہ مرتب کیا تھا اور اس کے مطابق اپنے رفقا سے تالیف و تصنیف کے

کام اپنی نگرانی میں کراتے رہے، چنانچہ سید صاحب کے مضامین کے علاوہ دارالمصنفین کی کتابوں نے خاص کر عہد وسطیٰ کی تاریخ ہند کے کتنے ہی تاریک گوشے روشن کر کے ملک میں مسلمانوں کے عہد کی سچی اور تابناک تصویریں پیش کیں جب کہ متعصب و عیار انگریز اور ان کے فرقہ پرست ہندو شاگرد تاریخ نویسی کے نام پر مسلم حکمرانوں کی جھوٹی اور بگڑی ہوئی تصویریں پیش کرنے میں لگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ اسکولوں اور کالجوں کی درسیات میں تاریخ نما افسانے پڑھا پڑھا کر نئی نسلوں کو گمراہ کر رہے تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ سیاست میں فرقہ وارانہ تفریق و تقسیم کا زہر ایسے ہی بے ضمیر اور بدکردار انگریز اور ہندو مورخوں کا بویا ہوا ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس قسم کی جاہلانہ تاریخ نویسی کو مورخانہ شتر مرغ کا نام دیا اور بتایا کہ جب غلط اندیش مورخوں کی جہالت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے تو وہ اسے تاریخی افسانہ کہہ کر پہلو بچاتے ہیں، ورنہ اپنے افسانوں ہی کو تاریخ بنا کر پیش کرتے ہیں، خاص کر اورنگ زیب کے سلسلہ میں تو ان افسانہ نگار مورخوں نے جہالت اور شرارت کی انتہا کر دی ہے اور ایک صالح و مصلح، پرہیزگار اور رعایا پرور بادشاہ کو جابر و متعصب حکمراں کی شکل میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کے کسی دور میں بوالہوسی اور اس کے حرم میں عشق بازی تک کا سراغ لگا لیا ہے۔

جس طرح صحیح تاریخ نویسی کے ذریعہ سید صاحبؒ ماضی کا رکارڈ درست کرانا چاہتے تھے، تا کہ حال کی درستگی کا سامان ہو، اسی طرح نصاب تعلیم کی اصلاح کر کے وہ مستقبل کی بہتری اور آیندہ نسلوں کی رہنمائی کا انتظام بھی کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں مختلف مواقع پر انھوں نے متعدد اہم تجویزیں پیش کیں اور کثرت کے ساتھ تعلیمی اجتماعات سے خطاب کیا، چنانچہ نہ صرف پورے ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی انھیں مشرقی تعلیمات پر ایک سند تسلیم کیا گیا اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے درسیات کی ترتیب میں ان کی خدمات حاصل کی گئیں، اس سلسلہ میں قدیم علماء کے ساتھ ساتھ جدید فضلاء کو بھی علوم مشرقیہ میں ان کی مہارت پر کامل اعتماد تھا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بعض صوبوں کی حکومتوں سے لے کر حکومت افغانستان تک نے اپنی درسگاہوں کے نصاب تعلیم کی تشکیل جدید کے لیے سید صاحبؒ کو دعوت دی اور انھوں نے

بڑی خوبی کے ساتھ یہ مشکل کام انجام دیا۔

سید صاحبؒ نے "حیات شبلی" لکھ کر سوانح نگاری کے فن میں ایک بیش بہا اضافہ کیا، یہ تصنیف نہ صرف یہ کہ اردو کے سب سے بڑے سیرت نگار، عظیم مورخ، بہت بڑے محقق، زبردست قائد، وسیع النظر عالم، صاحب طرز ادیب و خطیب اور فارسی کے سب سے بڑے ہندوستانی نقاد نیز منفرد شاعر کی سوانح حیات ہے بلکہ ہندوستان کی قومی و ملی نشاۃ ثانیہ کے سب سے اہم معمار اور اس کے پورے عہد کی اجتماعی سرگرمیوں کی سرگذشت ہے، دنیا میں مغرب کے علمی و فکری غلبہ کے بعد مشرق کی ذہنی و علمی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے کے لیے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جن علماء و فضلاء نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے ان میں سب سے بڑا نام علامہ شبلیؒ کا ہے، جنھوں نے ایک ایسا دبستان فکر ترتیب دیا جس ہر رکن اپنی جگہ ایک دبستان بن گیا اور جس سے اثر قبول کرنے والوں نے زمانہ کا رخ بدل دیا، خواہ وہ اقبال ہوں، ابوالکلام ہوں، سید سلیمان ہوں یا ابوالاعلیٰ، ایسی ہمہ گیر شخصیت کی کامیاب سوانح نگاری بجائے خود ایک کارعظیم ہے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے یہ کار عظیم کر دکھایا، "حیات شبلی" اردو کی سب سے بڑی سوانح عمری ہے۔

بات یہ ہے کہ شبلی اپنی ذات میں ایک دائرۃ المعارف تھے، ان کا علم بھی قاموسی تھا اور عمل بھی ہمہ جہت، یہی قاموسیت اور ہمہ جہتی خود علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت میں رو پذیر ہوئی اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کا دائرۃ المعارف بن کر ہی وہ اہم کمالات دکھائے اور عظیم کارنامے انجام دیئے جن کا ذکر گذشتہ سطور میں بہت ہی مختصر طور پر کیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ سید صاحبؒ نے ایک اردو انسائیکلوپیڈیا کی تحریک بھی زور و شور سے کی، مگر اس سلسلہ میں ان کو کافی اور موثر تعاون نہ ملا، بہر حال ان کی اپنی علمی کاوشیں اور دارالمصنفین کی کوششیں بجائے خود ایک قاموسی تحریک اردو زبان و ادب میں ثابت ہوئیں اور ان کے نتیجے میں بے شمار ادیب، محقق اور مصنف مختلف علوم و فنون میں پیدا ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اب تک

دنیائے اردو یا عالمِ اسلام کا کوئی علمی ادارہ دار المصنفین سے بڑھ کر گہوارۂ علم و ادب ثابت نہیں ہوا ہے۔

تقسیم ہند سے قبل تقریباً نصف صدی تک علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ذات ہندوستان میں علوم شرقی کا مرکز و مرجع تھی اور ملک کے تمام علمی ادارے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اپنے اہم ترین امور میں ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتے تھے، شاید ہی کوئی تعلیمی یا تہذیبی سرگرمی ہو جس میں سید صاحبؒ کے مشورے شامل نہ ہوں، مختلف مذہبی سماجی اور سیاسی تحریکوں میں بھی ان کی شمولیت اور ہدایت ضروری سمجھی جاتی تھی عالم اسلام کے مسائل میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کی جو اعلیٰ قیادت دلچسپی لیتی اور بین الاقوامی سطح پر کام کرتی تھی اس کے ایک اہم ترین رکن سید صاحبؒ بھی تھے، ان کے زیر ادارت دار المصنفین کا ترجمان ماہنامہ "معارف" ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی ترجمان تھا اور اس دورِ ادارت کا شاید ہی کوئی واقعہ قومی یا بین الاقوامی دائرے میں ایسا ہو جس پر محکم اور موثر تبصرہ "معارف" میں نہ ہوتا ہو، ملک کی تحریک آزادی ہو یا مشرق کی نشاۃ ثانیہ یا مغرب کی دو عظیم جنگوں کے اثرات، یا عالم اسلام کے واقعات، سبھی کے تاریخ ساز مسائل پر مدیر معارف کی عالمانہ و عاقلانہ رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

لیکن اپنے تمام علمی کمالات اور عملی مجاہدات کے باوجود علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عصر حاضر کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے نہ تو کوئی باضابطہ تحریک چلائی نہ مستقل تنظیم قائم کی، صرف ندوۃ العلماء کے تعلیمی، دار المصنفین کے تصنیفی اور معارف کے علمی اداروں سے کام لیتے رہے، ایسا اس لیے ہوا کہ وہ بڑے پیمانے پر منظم اقدام اور پیہم جد و جہد کے لیے آمادہ نہ تھے، خاص کر کسی سیاسی کش مکش کی قیادت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کی شخصیت کا یہی وہ میلان تھا جو انھیں تصوف کی طرف لے گیا اور وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

عہدِ عباسی میں کتبخانوں کی ترویج و اشاعت کے اسباب

از

ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، سینئر لائبریرین، بیرو یونیورسٹی، کانو، نائجیریا،

حکم اقرأ اور قیدوا العلم بالکتاب نے اہل علم کو علمی ذخیرہ کی کتابت، قرأت، جمع و تحفظ نشر و ابلاغ کا گرویدہ بنایا اور اس طرح انفرادی ذخائر سے کتب خانوں کا آغاز ہوا، دوسری صدی ہجری میں انفرادی، عمومی اور فنی و خصوصی ذخائر کا اس تیزی سے ارتقاء ہوا کہ گھر گھر کتب خانے قائم ہو گئے۔

عصر حاضر میں انفرادی کتب خانوں کو اہمیت حاصل نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خدمات سے خالی ہوتے ہیں لیکن عہد عباسی میں انفرادی کتب خانوں کی نوعیت اس سے یکسر مختلف تھی، وہ علمی ذخائر کا سرچشمہ تھے، تہذیبی و تمدنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عوام و خواص کے ذہنوں کو مصفا و مجلا کرتے اور کتابی تہذیب کے ارتقاء میں ممد و معاون تھے، وہ بجا طور پر اپنی خدمات کے اعتبار سے ادارہ جاتی کتب خانے کہے جانے کے مستحق تھے، ان کی طلب و رسد سے سوق الکتب آباد تھے، جگہ جگہ پڑھنے لکھنے کا چرچا تھا، اور کتابوں کے ملنے اور ان کے ابلاغ کی سہولت حاصل تھی۔

اس مقالہ میں ہم نے عہد عباسی میں کتب خانوں کی ترویج و اشاعت کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، انکی عددی حیثیت سے بحث کی ہے اور عہد عباسی میں شناخت کتب خانہ کے رہنما اصول کی نشاندہی کی ہے، امید ہے عہد اسلامی میں کتب خانوں کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملے گی، مسلمانوں کے کتب و کتب خانوں سے شغف، انکی حفاظت و اشاعت کا اور اس باب میں انکی سرگرمیوں کا نقشہ واضح ہو سکے گا نیز عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی میں انکی مساعی کا علم بھی،

عہدِ عباسی میں کتب خانوں کی ترویج و اشاعت کے اسباب

عہدِ اسلامی میں عباسی دور کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس دور کے اوائل ہی میں کتابوں اور کتب خانوں کا رواج ہو چکا تھا، کم و بیش ہر نامور عالم کے پاس ذاتی کتب خانہ ہوتا تھا، ہمارے اس خیال کی تائید حسب ذیل امور سے ہوتی ہے:

(۱) اس دور کے ائمہ فن ایک دوسرے کی کتابوں کا تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کرتے اور ایک دوسرے کی تردید میں کتابیں لکھتے تھے، یہ امر ان کے پاس ذاتی کتب خانہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے؛ چنانچہ عبداللہ بن نافع کا بیان ہے۔

"ابن ابی ذئب رحمہ اللہ (۸۰-۱۵۸ھ / ۶۹۹-۷۷۵ء)، عبدالعزیز ماجشون (م ۱۶۴ھ / ۷۸۰ء)، ابن ابی حازم (۱۰۷-۱۸۴ھ / ۷۲۵-۸۰۰ء)، محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ / ۷۶۸ء)، امام مالک بن انسؒ (۹۳-۱۷۹ھ / ۷۱۲-۷۹۵ء) پر تنقید کرتے تھے، ان میں زیادہ سخت محمد بن اسحاقؒ تھا، وہ کہتا تھا میرے پاس ان کی کتابیں لاؤ، میں ان کی خامیاں بتاؤں، میں ان کی کتابوں کا سالوتری ہوں"[1]

امام اوزاعیؒ (۸۸-۱۵۷ھ / ۷۰۷-۷۷۴ء) نے امام اعظم ابوحنیفہؒ (۸۰-۱۵۰ھ / ۶۹۹-۷۶۷ء) کی کتاب السیر (جنگی قوانین) کی تردید میں کتاب لکھی تو امام ابو یوسفؒ المتوفی ۱۸۲ھ نے ان کی تردید میں الرد علی سیر الاوزاعی لکھی[2]

پھر امام ابو یوسفؒ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ (۷۴-۱۴۸ھ / ۶۹۳-۷۶۵ء) کے اختلافات فقہی پر اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ لکھی[3]، امام محمدؒ المتوفی ۱۸۹ھ نے امام مالکؒ کی تردید میں کتاب الحجۃ تصنیف کی[4]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عالم کا ذخیرۂ کتب دوسرے عالم کے پیش نظر رہتا تھا۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۴ [2] الرد علی سیر الاوزاعی از ابو یوسف یعقوب تحقیق ابی الوفا الافغانی مصر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد الدکن ۱۳۵۷ھ ص ۴ مقدمۃ المحقق [3] اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ، از امام ابو یوسف القاضی تحقیق ابی الوفا الافغانی لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۴ مقدمۃ المحقق [4] الحجۃ علی اہل المدینۃ لمحمد بن الحسن الشیبانی تحقیق مہدی حسن الکیلانی مطبعۃ المعارف الشرقیہ الہند ۱۳۸۵ھ

(۲) یہ ائمہ فن اور علماء ایک دوسرے سے کتابیں مستعار لیتے تھے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ مورخ ابن سعد کاتب واقدی المتوفی ۲۳۰ھ سے مورخ واقدی المتوفی ۲۰۷ھ کی تصانیف مستعار لے کر مطالعہ کرتے تھے[1]، امام شافعیؒ امام محمدؒ سے کتابیں لے کر پڑھتے تھے[2]، امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے[3]۔

(۳) ائمہ فن اور اکابر علماء اہل علم کو دوسرے ائمہ فن کے ذخیرۂ علمی کو پیش نظر رکھنے، حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کرنے کی ترغیب دیتے اور تاکید کرتے تھے، چنانچہ امام شافعیؒ امام اعظمؒ کے سرمایہ علمی کے متعلق فرماتے تھے۔

الناس عیال علی ابی حنیفۃ فی الفقہ[4] — فقہ میں لوگ امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔

(۴) رحلہ (Travel for Research Work)

علوم کی تاسیس اور ترویج و اشاعت کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، تمام علوم خاص طور پر تین اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ وہ علوم تھے اور ہیں، جن میں استنباط مسائل و استخراج معانی کا سلسلہ برابر قائم ہے، اور اس کا میدان ابھی بہت وسیع ہے۔ عہد عباسی میں ہر بڑا عالم اپنی زندگی کا قیمتی حصہ اس کے معانی پر غور کرنے، سمجھنے اور ان سے مسائل استنباط کرنے میں صرف کرتا تھا، ان کے علمی ذخائر کو حاصل کرنے کے لیے سفر نہایت ضروری تھا اسی لیے عہد عباسی میں مفسرین، محدثین، و فقہاء مشرق و مغرب کے دور دراز ممالک کا سفر کرتے تھے، پھر دوسرے علوم کی تکمیل و تحصیل کتب کے لیے بھی اسی طرح سفر کیا جانے لگا تھا، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس سفر (رحلہ) کی غرض و غایت علوم و فنون میں

---

[1] تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۲۲ [2] البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ج ۱۰ ص ۲۰۲-۲۰۳ [3] تالیف الخطیب ص تالیف محمد زاہد الکوثری ص ۳۰ [4] مناقب الامام ابی حنیفہ و صاحبیہ ابی یوسف و محمد بن الحسن للذہبی حیدرآباد الدکن لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ ۱۳۶۶ھ ص ۱۹۔

تحقیق و تدقیق، اساتذۂ فن کے ذخیرۂ کتب و کتب خانوں کی تحصیل اور ان کی نشر و اشاعت بھی یہ رحلہ اسی مقصد سے کیا جاتا تھا، چنانچہ ابو سفیان محمد شکری معمری المتوفی ۱۸۲ھ کے متعلق علامہ سمعانی رقمطراز ہیں۔

انما اشتهر بهذه النسبة لرحلته الی معمر بن راشد الصنعانی لتحصیل کتبه وحدیثه[1]	موصوف کو معمر بن راشد صنعانی کی طرف نسبت سے شہرت حاصل ہے، موصوف نے سفر یمن ان کی کتابیں اور حدیثیں جمع کرنے کے لیے کیا تھا، اور خالد بن نزار ایلی کا بیان ہے۔
رحلت لکتب ابن جریج سنة خمسین ومائة فوجدته قد مات[2]	میں نے ابن جریج کی طرف ۱۵۰ھ میں سفر کیا، جب ان کے پاس پہنچا تو اس وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مقدس سفر علوم و فنون میں اختصاص حاصل کرنے، اساتذۂ فن کے فیوض علمی، ان کی کتابوں اور ان کے کتب خانوں کی ترویج و اشاعت کے لیے کیا جاتا تھا۔

(۵) عہد عباسی میں ہر طالب علم اپنے استادوں کی امالی (Lectures) قلمبند کرتا، ان کی کتابیں جمع کرتا، انھیں جی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اس لیے انہی کتابوں کے نسخے اس کے لیے سند ہوتے تھے، اکثر ان پر اس کے شیوخ و اساتذہ کے دستخط ہوتے یا ان سے پڑھنے کی صراحت ہوتی تھی، اس قسم کے نسخوں کو "الاصول" کہا جاتا تھا، اس دور میں ہر فن کا طالب علم اس نوع کا ذخیرۂ کتب دور طالب علمی ہی سے جمع کرنے لگتا تھا، جو اس کے پاس تحصیل علوم کے زمانے تک بہت بڑی تعداد میں جمع ہو جاتا تھا اور آیندہ اہل علم کو نقل کرنے اور پڑھنے

[1] الانساب للسمعانی، ورق ۵۳۲ ب ۳۶۶ [2] العبر ج ۱ ص ۲۲۶

مطالعہ کرنے کے لیے عاریۃً دیا جاتا تھا، جیسا کہ مورخ ابن سعد کاتب واقدی کے مذکورۂ بالا واقعہ سے ثابت ہے کہ یہ علماء "الاصول" کو اشاعت کے لیے اپنے پاس رکھتے تھے، چنانچہ نامور محدث ابو سہیل ہارون بن احمد استرابادی المتوفی ۳۶۳ھ جن کے متعلق حاکم نیشاپوری نے لکھا ہے،

کان صحیح الاصول، کثیر الحدیث[1]	موصوف کے پاس کتابوں کے اصل صحیح نسخے اور بہت حدیثیں تھیں۔

اور مورخ مستغفری نے "تاریخ نسف" میں لکھا ہے کہ

روزانہ ظہر کی نماز کے بعد باب مقصورہ پر املا کراتے تھے، جن میں عامہ اہل علم اور امیر زادے شرکت کرتے تھے، میں بھی اپنے بھائی، چچا، خدام اور اتالیق ابو علی منصور بن محمد کے ہمراہ ان کی کئی مجلسوں میں شریک ہوا تھا، اس وقت میری عمر دس برس کی تھی، میرے سماع احادیث کا آغاز انہی کی مجالس املا سے ہوا تھا، موصوف جامع مسجد اور ابو القاسم عبد اللہ کے محل سرا میں جو انھیں اپنے فرزند ابو نصر کی تعلیم کے لیے بخارا میں لایا تھا، "احادیث ابی حنیفہ عن ابی الولید الطیالسی و ابراہیم بن بشار وغیرہما" نیز "اخبار مکہ" اور اپنے فوائد پڑھاتے تھے جو کچھ لوگوں نے ان سے سنا اور حاصل کیا تھا وہ "خان بزازین" کے فتنہ صفر ۳۴۲ھ میں برباد ہوا، اور ان کے مسموعات میں سے لوگوں کے پاس بہت تھوڑا رہا تھا[2]

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عامۂ اہل علم استاد سے جو پڑھتے وہ لکھ لیتے تھے، اُن کا ذخیرۂ علمی کتابوں کی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہوتا تھا، وہ گاہ بگاہ حوادثِ روزگار سے

[1] الانساب للسمعانی تحقیق عبد الرحمن الیمانی، حیدرآباد دکن مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۸۲ھ ج ۱ ص ۲۰۲ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۰۳۔

ضائع ہو جاتا تھا جیسا کہ ابو سہیل کا املا کرایا ہوا ذخیرۂ کتب بلوے میں برباد ہو گیا تھا۔ ابو موسیٰ ہارون بن محمد ازاذواری جوینی المتوفی ۳۱۳ھ بلند پایہ ادیب و فقیہ تھے، نیشاپور میں پڑھا اور بغداد میں لکھا تھا موصوف کے متعلق حاکم نیشاپوری کا بیان ہے۔

اذا ورد البلد یحش مشائخنا[1] موصوف کا جب نیشاپور میں ورود ہوتا تو ہمارے مشائخ کو ان کی آمد سے خوشی ہوتی تھی۔

موصوف کی آمد سے خوشی کا اصل سبب ان کا علم اور ان کا وہ علمی ذخیرہ تھا، جو عامۂ اہل علم کے علم میں اضافہ کا سبب ہوتا تھا۔

(۶) اساتذہ کا اپنے شاگردوں کو کتابوں کی روایت کی اجازت دینے کا رواج شروع سے تھا، ان اقسام اجازت میں سے جن کا رواج فروغ علم کی وجہ سے عہد عباسیہ میں زیادہ تھا چوتھی قسم "مناولہ" بھی ہے، اس میں شیخ اپنا اصلی نسخہ یا اسکی نقل شاگرد کو دیتا خواہ مالک بنا دیتا، خواہ عاریۃً دیتا تاکہ طالب علم اس کو نقل کر کے اس کا مقابلہ کرے۔[2] اس سے بھی استاد، شاگردوں کے ذخیرۂ علمی میں اضافہ کرتا تھا، دستور کے مطابق ہر پڑھا لکھا ذخیرۂ کتب رکھنے کا پابند ہوتا تھا۔

(۷) عہد عباسی میں اپنے نوشتہ کے علاوہ بیان کرنا بھی عالم کی غلطی سمجھی جاتی تھی،[3] اس لیے بھی ذاتی کتب خانوں کا اس دور میں بکثرت قیام عمل میں آیا اور انھیں غیر معمولی فروغ حاصل رہا۔

---

۱ کتاب الانساب للسمعانی، ج ا ص ۶۔ ۲ الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ وتقیید السماع بعیاض بن موسیٰ الیحصبی تحقیق احمد صقر القاہرہ: دار التراث ۱۳۸۹ھ ص ۸۰۔ الکفایہ فی علم الروایۃ للخطیب، حیدرآباد دکن، مطبعۃ جمعیۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۵۷ھ ص ۳۳۰۔ علوم الحدیث لابن الصلاح تحقیق نور الدین عتر، حلب مطبعۃ الاصیل ۱۳۸۶ھ ص ۱۴۷، ۱۴۷۔ ۳ عیون الاخبار لابن قتیبہ القاہرۃ مطبعۃ دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ ج ۲ ص ۱۴۰۔

(۸) یہ بھی حقیقت ہے کہ عہد عباسی میں تاریخ، تذکرہ اور طبقات کی کتابوں میں بلند پایہ شخصیتوں، صاحب فن اور مشہور و معروف عالموں کا تذکرہ ہی قلمبند کیا جاتا تھا جن کے علم کا دریائے فیض کتابی و تدریسی خدمات کی صورت میں رواں رہتا تھا چنانچہ ابو الطیب عبد الواحد لغوی المتوفی ۳۵۱ھ مراتب النحویین میں رقمطراز ہیں۔

ہم نے کتاب میں جس ترتیب پر اہل عراق کا ذکر کیا ہے، ان پر علم اعراب ختم ہوا ہے۔ اور یہ وہ اصحاب کتب و مرجع علم و فن تھے جن سے علم اعراب میں رجوع کیا جاتا اور مشکل مسائل کو حل کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ کے علماء میں ہم نے اگر کسی کو چھوڑا ہے تو اس کی حسب ذیل تین وجوہ ہیں۔

۱۔ یا تو وہ امام فن نہیں تھا اس کے قول پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔

۲۔ یا اس کا کوئی ایسا شاگرد نہیں نکلا جو اس کے نام کو زندہ رکھتا۔

۳۔ یا اس نے کوئی ایسی تالیف نہیں چھوڑی جس کی نشر و اشاعت اہل علم ضروری سمجھتے ہوں جیسا کہ ہمارا یزیدیوں کے تذکرہ سے صرف نظر کرنا حالانکہ ان کا گھرانہ ایک علمی خانوادہ تھا، یہ سب اپنے جد امجد یحییٰ بن مبارک یزیدی سے نسبت رکھتے ہیں اور وہ ابو زید اصمعی، ابو عبیدہ اور کسائی کے طبقہ کا تھا اس نے علوم کی تحصیل ابو عمرو، عیسیٰ بن عمر، یونس اور ابو الخطاب اکبر سے کی تھی، اس نے ابو عمرو سے قرأت مشہورہ روایت کی ہے جو لوگوں میں متداول ہے مگر اس کا علم رواۃ کے بارہ میں قلیل ہے البتہ اس کی اولاد اور اس کے خانوادہ میں اس کا چرچا زیادہ ہے، وہ ثقہ، امین اور قدیم بلند رتبہ عالم تھا۔[1]

---

۱ مراتب النحویین تالیف ابو الطیب عبد الواحد اللغوی تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم القاہرہ مکتبۃ نہضۃ مصر ۱۳۷۵ھ ص ۸۸

موصوف نے ایک اور مقام پر لکھا ہے :۔

انما شهرة العالم بمصنفاته و الرواية عنه[1] — عالم کی شہرت اس کی تصانیف اور اس سے روایات کرنے والوں سے ہوتی ہے۔

اس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عہد عباسی میں کسی عالم کی شہرت کی بنیادی وجہیں دو ہی تھیں، ایک تصنیف و تالیف کے ذریعہ کتابی سرمایہ میں اضافہ اور دوسری روایت کے ذریعہ علم کی نشر و اشاعت، دور عباسی میں تذکرہ نگاری کے اندر کم و بیش انہی اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، اس لئے تذکرہ نگار جب کسی عالم کا تذکرہ لکھتے ہیں تو اس کے حالات میں تصریح کرتے ہیں کہ اس نے کن سے پڑھا، کہاں پڑھا، کن فنون میں کمال پیدا کیا، کہاں املا کرایا، کہاں وعظ کہا، کہاں مناظرہ کیا، کیا کیا لکھا، کن اہل علم اور ارباب فن کو اس سے تلمذ کا فخر حاصل رہا، کن مسجدوں، مدرسوں، سرایوں، تکیوں میں پڑھایا، کن خانقاہوں اور مشہدوں میں فروکش رہا، کن اہم مقامات میں وہ سفر کرتے ہوئے ٹھہرا، یہ وہ مقامات تھے جہاں عموماً کتب خانے قائم کیے جاتے تھے چنانچہ ابوسلمہ نصر شاشی ایلاقی المتوفی سنہ ۳۹۰ھ جو ایلاق کے قائدین میں سے تھے شاش میں رہتے تھے، ہیثم بن کلیب شاشی سے پڑھا تھا، امام بخاری سے بیک واسطہ حدیث روایت کرتے تھے، لوگوں نے ان سے بہت حدیثیں لکھی ہیں[2]، مورخ ابوسعد ادریسی کا بیان ہے کہ موصوف حج کے لیے جاتے ہوئے سمرقند آئے اور باب دستان کے پاس رباط الامیر میں اترے تو ہمارے اصحاب نے ان سے لکھا اور میں نے موصوف سے شاش میں سنہ [illegible]ھ سے قبل لکھا تھا[3]۔

---

[1] مراتب النحویین تالیف ابوالطیب عبدالواحد اللغوی تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، القاہرہ، مکتبہ نہضۃ مصر ۱۳۷۵ھ ص ۱۰۰ [2] کتاب الانساب ج ۸ ص ۱۳۴ [3] ایضاً

عہد عباسی میں کم و بیش ہر عالم کے پاس ذاتی کتب خانہ ہونا مبالغہ نہیں حقیقت ہے، کیونکہ اوائل عہد عباسی میں ایسے ایسے ائمۂ فقہ، ائمۂ حدیث، ائمۂ لغت، ائمۂ نحو و ادب کے پاس ذاتی کتب خانوں کا سراغ ملا ہے جن کے کتب خانوں کا نام سن کر لوگوں کو تعجب ہوگا۔ چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہؒ (۸۰-۱۵۰ھ / ۶۹۹-۷۶۷ء) امام مالکؒ (۹۳-۱۷۹ھ / ۷۱۲-۷۹۵ء) امام اوزاعیؒ (۸۸-۱۵۷ھ / ۷۰۷-۷۷۴ء) امام ابویوسفؒ (۱۱۳-۱۸۲ھ / ۷۳۱-۷۹۸ء) امام محمدؒ (۱۳۱-۱۸۹ھ / ۷۴۸-۸۰۴ء) امام شافعیؒ (۱۵۰-۲۰۴ھ / ۷۶۷-۸۲۰ء) امام احمدؒ (۱۶۴-۲۴۱ھ / ۷۸۰-۸۵۵ء) امام بخاریؒ (۱۹۴-۲۵۶ھ / ۸۱۰-۸۷۰ء) امام مسلمؒ (۲۰۴-۲۶۱ھ / ۸۲۰-۸۷۵ء) امام فن جرح و تعدیل ابو زرعہ عبیداللہ رازیؒ (۲۰۰-۲۶۴ھ / ۸۱۵-۸۷۸ء) امام لغت و ادب خلیل بن احمد بصری (۱۰۰-۱۷۰ھ / ۷۱۸-۷۸۶ء) امام نحو ثعلب (۲۰۰-۲۹۱ھ / ۸۱۶-۹۰۴ء) وغیرہ کے پاس ذاتی کتب خانے موجود تھے، یہ ائمۂ فن اپنی خداداد و مجتہدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے سرچشمۂ علوم تھے ان کی مہارت فن، جلالت شان اور زبردست حافظے کے پیش نظر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ابتدائی دور میں یہ اپنے ذاتی کتب خانوں کے ذریعہ علوم و فنون کی تدوین کرتے، انھیں فروغ دیتے، کتب اور کتب خانوں کے ترقی پذیر سلسلہ کو پروان چڑھانے کی سعی پیہم کر رہے تھے، ان میں بعض ائمۂ فن ایسے بھی تھے مثلاً ثعلب جن کے متعلق ان کے معاصرین نے تصریح کی ہے کہ درس اور ملاقات کے وقت ان کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی، بایں ہمہ ان کے پاس کتب خانہ تھا، یعنی بظاہر ذاتی کتب خانہ نہ ہونے کی دلیل کے باوجود ان کے پاس ذاتی کتب خانہ موجود تھا[1]۔ ابوبکر محمد بن قاسم انباری نحوی (۲۷۱-۳۲۸ھ / ۸۸۴-۹۴۰ء) جن کے متعلق تذکرہ نگاروں کا بیان ہے۔

كان يملي من حفظه وما كتب — موصوف اپنے حافظے سے املا کراتے تھے ان سے

---

[1] کتاب الانباہ للقفطی ج ۱ ص ۱۴۸ [2] طبقات النحویین واللغویین تالیف محمد بن الحسن الزبیدی تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم مصر، محمد سامی امین الخانجی ۱۳۷۳ھ ص ۱۶۶، کتاب الانباہ ج ۱ ص ۱۴۸، معجم الادباء ج ۲ ص ۱۴۴-۱۴۵

عنه الاملاء قائلا عن حفظه ۔[1] املا زبانی ہی لکھی گئی ہے ۔

یہ مذکورۂ بالا بیان موصوف کے پاس کتب خانہ نہ ہونے کی دلیل ہے حالانکہ ان کے پاس زبردست کتب خانہ تھا۔ ان حقایق کی روشنی میں مذکورۂ بالا دعوی کہ عہد عباسی میں کم وبیش ہر عالم کے پاس نجی کتب خانہ تھا، کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ۔

امام ثعلب کے مذکورۂ بالا واقعہ سے یہ امر بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ دوسری تیسری صدی ہجری میں درس اور ملاقات کے موقعہ پر کسی عالم کے ہاتھ میں کتاب کا نہ ہونا موجب حیرت وتعجب تھا ۔ یہ اس حقیقت کا نہایت بین ثبوت ہے کہ اس دور میں اہل علم کا اپنے پاس کتابیں اور کتب خانہ رکھنا معمول سا بن گیا تھا، اور ان کو کتابوں سے ایسا شغف ہو گیا تھا کہ درس کے وقت ہی نہیں ملاقات کے وقت بھی ان کے ہاتھ سے کتاب نہیں چھوٹتی تھی، یہ تاریخی شہادتیں دائمی کتب خانوں کے وجود ہی کو ثابت نہیں کرتیں بلکہ ذاتی کتب خانوں کی کثرت کی بھی شاہد عدل ہیں ۔

مشہور مورخ محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ - ۲۰۷ھ / ۷۴۷ء - ۸۲۳ء) جن کے ذاتی کتب خانہ میں ایک سو بیس بار شتر کتابیں تھیں، مورخین اور تذکرہ نگاروں نے صرف واقدی کے کتب خانے کا ذکر بھی ایک خاص واقعہ کی وجہ سے کیا ہے کہ انھیں بغداد کے مغربی حصہ سے مشرقی حصہ میں مکان تبدیل کرنا پڑا تو کتابیں ایک سو بیس اونٹوں پر لے جانی پڑی تھیں ورنہ ان کے معاصرین میں سے ہر ایک کے پاس اس سے بھی زیادہ کتابوں پر مشتمل کتب خانہ موجود تھا چنانچہ مورخ واقدی کا بیان ہے ۔

ما من احد الا وکتبه اکثر من حفظه وحفظی اکثر من کتبی ۔[2]

میرے معاصرین میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی کتابیں اس کے حفظ سے زیادہ نہ ہوں البتہ میرا حفظ میری کتابوں سے زیادہ ہے ۔

---

[1] کتاب الانساب ج ۱ ص ۳۵۴ [2] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۱۹۲ [3] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۶ [4] عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر تالیف محمد بن محمد ابن سید الناس، القاهرة، مکتبة القدسی ۱۳۵۶ھ ج ۱ ص ۱۸۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اہل علم کا ذخیرۂ علمی اتنی وسعت اختیار کر گیا تھا کہ اتفاق سے اگر کسی نامور عالم یا اہل فن کے یہاں گھر کے کسی کونے میں رکھا ہوا ذخیرۂ کتب دکھائی دیتا تو اہل علم کی نظروں میں سماتا نہیں تھا حیرت وتعجب سے پوچھا جاتا تھا، کہ کیا جناب کے پاس کل اتنا ہی کتابوں کا ذخیرہ ہے، چنانچہ ابراہیم بن سفیان زیادی المتوفی ۲۴۹ھ کا بیان ہے ۔

"ایک شخص خراسان سے اصمعی المتوفی ۲۱۶ھ کے پاس آیا جب وہ اصمعی سے مانوس ہو گیا تو اس نے ان سے ایسے موقعہ پر پوچھا جب وہ گھر میں تشریف فرما تھے کہ جناب کی کتابیں کہاں ہیں، اصمعی نے زاویۂ بیت (گھر کے ایک گوشہ) کی طرف اشارہ کیا اس نے اسے بہت تھوڑا سمجھا اور کہا بس اتنا ہی ہے، اصمعی نے کہا حقیقت میں یہ بھی اپنی ندرت کے اعتبار سے بہت ہے ۔"[1]

مورخ واقدی کے مذکورۂ بالا بیان میں ما من احد کے الفاظ عام ہیں جو شاہان عباسی کے زیر نگیں پورے اسلامی قلمرو کے معاصر علماء پر یکساں صادق آتے اور منطبق ہوتے ہیں، لیکن کسی وجہ سے اگر اس کا دائرہ خاص علماء اور نامور ارباب فن تک محدود رکھا جائے تو بھی دوسری تیسری صدی ہجری میں بغداد کے اندر ذاتی بڑے کتب خانوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو تو چنداں مستبعد نہیں ۔

مورخین اور تذکرہ نگاروں نے مورخ واقدی کے تمام مشہور معاصرین کا تذکرہ قلمبند کیا ہے لیکن معدودے چند کے سوا کسی کے کتب خانے کا ذکر انکے یہاں نہیں ملتا جو ہمارے اس دعوے کی نہایت قوی دلیل ہے کہ عہد عباسی میں کتب خانے مسلم معاشرے کے لوازم زندگی بن چکے تھے، اور

---

[1] مراتب النحویین، ص ۴۹ - ۵۰ ۔

کم و بیش ہر ایک عالم کے پاس ذاتی کتب خانہ ہوتا تھا، اس لیے ہر ایک کے تذکرہ میں اسکے کتب خانے کے ذکر کرنے کا چنداں اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔

اس دور میں ارباب کمال کی اسلامی قلمرو میں جیسی کثرت تھی اسکا اندازہ صرف بصرہ میں ارباب فن کی تعداد سے کیا جاسکتا ہے، چنانچہ واقدی کے معاصر اور خلیل بن احمد بصری کے نامور شاگرد نضر بن شمیل (۱۲۲ھ – ۲۰۳ھ / ۷۴۰ء – ۸۱۹ء) نے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے جب بصرہ کو خیر آباد کہا اور خراسان کا رخ کیا تو تین ہزار اہل علم انھیں رخصت کرنے مربد تک گئے تھے، انکے متعلق ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ نضر بن شمیل کو رخصت کرنے والوں میں کوئی جلیل القدر محدث، کوئی نحوی، کوئی لغوی، کوئی عروضی اور کوئی اخباری تھا۔[۱]

مربد میں نضر نے ان ارباب کمال سے کہا تھا کہ مجھے بصرہ میں ایک یا دو کلچے بھی پیٹ بھر کھانے کو مل جاتے تو میں بصرہ کو چھوڑ کر نہ جاتا، نضر بن شمیل کا کتب خانہ تھا اور جو علماء علم و کتب اور کتب خانوں کے فروغ و ترقی میں سرگرم عمل تھے انھیں وطن سے نکلنے نہیں دیا جاتا تھا، اسی لیے نضر بن شمیل کو اہل بصرہ سے یہ بات کہنی پڑی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی نامور عالم کسی شہر میں اقامت پذیر ہوتا اور اس کی مساعی جمیلہ سے اس بستی یا شہر میں علم اور کتابوں کو فروغ و ترقی ہوتی تو اس کا وہاں سے نکلنا اہل شہر کو گوارا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ معمر بن راشد صنعانی المتوفی ۱۵۲ھ نے جو بصری تھے، صنعاء کو چھوڑ کر بصرہ آنا چاہا تو اہل صنعاء نے صنعاء میں ان کی شادی کر دی اور پھر ان کا صنعاء سے نکلنا نہ ہوسکا۔[۲] اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ جن ارباب فن سے شہر، بستی اور کوچہ کو فخر حاصل ہوتا تھا

---

[۱] طبقات النحویین واللغویین للزبیدی، ص ۵۳، الانباہ للقفطی ج ۳ ص ۳۴۹، ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۱، [۲] تہذیب التہذیب لابن حجر، حیدر آباد الدکن مطبعۃ دائرۃ المعارف النعمانیہ ۱۳۲۶ھ ج ۱۰ ص ۲۴۵

ان کو شہر اور بستی میں، رکھنے کی ہر تدبیر کی جاتی تھی انھیں بجا لیا تی اور سماجی بندھنوں میں باندھا جاتا تھا تاکہ رفاقت کی وجہ سے داغ مفارقت نہ دے سکیں۔

ابو عبیدہ نے نضر بن شمیل کا مذکورۂ بالا واقعہ کتاب مثالب اہل البصرہ میں اہل بصرہ کی مذمت بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے، جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی ورنہ پتہ بھی نہ چلتا کہ بصرہ جیسا چھوٹا سا شہر تین ہزار ایسے گوناگوں باکمال علماء سے آباد تھا، وہ علماء جو نضر بن شمیل کو رخصت کرنے نہیں گئے یا نہیں جاسکے تھے ان کی تعداد کا تو کوئی علم نہیں، ظاہر ہے ایسے علم دوست اور علمی قدر دانوں کے متعلق واقدی کی مذکورۂ بالا شہادت کی موجودگی میں یہ کہنا درست ہے کہ ان تین ہزار علماء و فضلاء کے پاس نجی کتب خانوں کا ہونا ظاہر و باہر ہے۔

علماء اور ارباب کمال کی اتنی بڑی تعداد جہاں آباد ہوتی تھی ایسے شہر اور ایسی بستی کے لیے بلاد اسلامی کے جغرافیہ نویس علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

هذه النسبة الی البصرة وشهرتها اغنتنی عن ذکرها لکن ذکرتها لکی لا یخلو الکتاب عنها۔[۱]

یہ بصرہ کی طرف نسبت ہے اور اسکی شہرت نے مجھے اس کے ذکر سے مستغنی کر دیا ہے، لیکن میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ کتاب اس کے ذکر سے خالی نہ رہے۔

یاقوت کا بیان ہے:۔

والمنسوبون الیها من اهل العلم لا یحصون[۲]

اور بصرہ کی طرف اہل علم کی اتنی بڑی تعداد منسوب ہے کہ شمار نہیں کی جاسکتی۔

اسی علمی ثروت کی وجہ سے بصرہ کو "خزانۃ العرب" کہا جاتا تھا۔[۳]

---

[۱] کتاب الانساب ج ۲ ص ۲۵۷ [۲] معجم البلدان ج ۱ ص ۴۳۰ [۳] کتاب الانساب ج ۲ ص ۲۵۳

اس قسم کی معلومات تذکرہ، تاریخ وطبقات کی کتابوں کے علاوہ انساب، وجغرافیہ بلاد کی کتابوں میں بھی بکثرت ملتی ہیں، ان کی اصل غایت اس عالم کے حدود استفادہ وافادہ علمی کو بیان کرنا اس کے حلقہ اثر کو جاننا، اشاعت علم، کتابوں اور کتب خانوں کے فروغ وترقی میں اس کی مساعی جمیلہ کو بیان کرنا، اس کے ذخیرۂ کتب سے اس خطہ کے اہل علم کے استفادہ وفیض عام کی صراحت کرنا ہوتا تھا اسی لئے تذکرہ نگار اس عالم کا جو پہلی مرتبہ کسی امام فن کے ذخیرہ سے کسی خاص خطۂ ارضی اور کسی خاص اسلامی شہر کو روشناس کراتا تھا اس کا تعارف اول من ادخل کتب فلان[1] (موصوف سب سے پہلے فلاں کی کتابیں لے کر پہنچے تھے) کے شاندار الفاظ سے کراتے تھے۔

عہد عباسی میں مورخین اور تذکرہ نگاروں کا طبقات[2]، مکاتیب فکر[3]، ادبا[4]، اقالیم و ممالک[5]، انساب[6]، والقاب[7] اور کنیٰ[8] پر کتابیں لکھنے، کتب تاریخ میں ہر سنہ کے بعد مشاہیر کی وفیات ذکر کرنے کی غرض وغایت ہی مشاہیر عصر، نامور ارباب فن، اہل علم واہل قلم کے فیضان واثر کو بیان کرنا اور ان کی تحقیقات سے علمی دنیا کو متعارف کرانا ہوتا تھا،[9] جس سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۰۰، المذاہب الفقہیۃ الاربعۃ الحنفی، المالکی، الشافعی، الحنبلی وانتشارہا عند جمہور المسلمین لاحمد تیمور باشا مع دراسۃ تحلیلیۃ لمحمد ابی زہرۃ، القاہرۃ لجنۃ نشر المؤلفات التیموریۃ، ج ۱، ت ص ۶۵، ۸۲، ۸۳ [3] کتاب مشاہیر علماء الامصار تالیف محمد بن حبان البستی تحقیق فلایشہر القاہرہ مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر ۱۳۷۹ھ ص [2] طبقات الفقہاء لابی اسحاق ابراہیم الشیرازی تحقیق احسان عباس، بیروت، دار الرائد العربی سنہ ۱۹۷۰ء ص ۳۱ [4] مراتب النحویین ص ۳ مقدمۃ المحقق طبقات النحویین واللغویین ص مقدمۃ المحقق [5] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۲، مروج الذہب ومعادن الجوہر للمسعودی تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید مصر مطبعۃ السعادۃ ۱۳۶۷ھ ج ۱ ص ۱، یتیمۃ الدہر فی محاسن اہل العصر للثعالبی تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید القاہرۃ، مطبعۃ حجازی ۱۹۴۷ء ج ۱ ص ۴ [6] تلخیص مجمع الآداب فی معجم الالقاب تالیف عبد الرزاق ابن الفوطی تحقیق مصطفیٰ جواد دمشق المطبعۃ الہاشمیۃ [7] تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۰ [8] اللباب ج ۱ ص المؤتلف والمختلف تالیف الحسن بن بشر الآمدی تحقیق عبد الستار احمد فراج القاہرۃ عیسیٰ البابی الحلبی ۱۳۸۱ھ ص [9] وفیات الاعیان لابن خلکان تحقیق احسان عباس، بیروت دار الثقافہ ۱۹۶۹ء ج ۵ ص ۳۲۵۔

سوانح حیات وکتابیات کو بھی تنوع، وسعت اور فروغ حاصل ہوتا رہا۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ مورخ ابو عبداللہ ابن سعد کاتب واقدی (۱۶۸-۲۳۰ھ) نے الطبقات الکبیر کو اسلامی صوبوں پر مرتب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مقصد پہلی، دوسری اور تیسری صدی میں اسلامی قلمرو کے مختلف صوبوں اور شہروں کی علمی ترقی، علماء واہل فن کی علمی وفنی سرگرمیوں کو بیان کرنا ذخائر علمی اور کتب خانوں کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔

انہی حقائق کی وجہ سے علامہ سمعانی اور یاقوت رومی وغیرہ اسلامی قلمرو کے ایک ایک کوچے، بستی، قصبے، شہر، صوبے اور ملک کے متعلق اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ یہ بستی محدثین سے آباد تھی، اس محلے میں ادباء رہتے تھے، یہ بڑا مردم خیز خطہ تھا، یہاں سے ہر فن میں ارباب کمال نکلے ہیں، اس سرزمین سے گذشتہ وموجودہ ہر دور میں علماء وفضلاء نکلتے رہے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس خطہ کو فروغ علم، فروغ کتب اور کتب خانوں کی ترویج واشاعت میں امتیاز حاصل رہا ہے، کتاب الانساب سمعانی اور معجم البلدان یاقوت سے بطور نمونہ حرف الف کی تقطیع سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، اس سے حقیقت حال واضح ہو جائے گی، علامہ سمعانی اصفہان[1] کی ایک بستی آبی کے متعلق رقمطراز ہیں "خرج منہا جماعۃ من المشاہیر"[2] اس بستی سے نامور اہل علم کی ایک جماعت نکلی ہے، آجری جو بغداد کے غربی گوشہ میں نہر طابق کا ایک محلہ ہے، اس کے متعلق یاقوت لکھتے ہیں، اس میں بہت سے علماء رہتے ہیں،[3] اسکاف کے متعلق موصوف کا بیان ہے نامور علماء ادباء، حکام، محدثین کی بہت بڑی تعداد یہاں سے نکلی ہے۔[4] آمد ایک بہت پرانا چھوٹا مضبوط شہر تھا، اس کے متعلق سمعانی فرماتے ہیں یہاں سے ہر فن کے علماء نکلے ہیں،[5]

---

[1] کتاب الانساب، ج ۱ ص ۴۸ [2] معجم البلدان ج ۱ ص ۵۱ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۱

[4] کتاب الانساب ج ۱ ص ۸۲،

دور آمل طبرستان کے متعلق لکھتے ہیں، قدیم و جدید اہل علم کی ایک جماعت اس کی طرف منسوب ہے، یہاں سے ہر فن کے علماء نکلے ہیں۔[1]

علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں (۴۵۲۶) مشہور نسبتوں کا ذکر کیا ہے جن میں ابتدائی (۴۲) نسبتوں میں دو سو نامور علماء کا تذکرہ کیا ہے، اس حساب سے صرف کتاب الانساب میں تقریباً چودہ پندرہ ہزار نامور علماء و فضلاء کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔[2] اگر ایک نسبت میں صرف ایک ہی قابل قدر کتب خانہ شمار کیا جائے تو چھٹی صدی ہجری میں اسلامی دنیا میں کم از کم ساڑھے چار ہزار عوامی، شاہی اور ذاتی کتب خانوں کی تعداد پہنچتی ہے ورنہ دس بارہ ہزار سے کسی طرح کم نہیں قرار دی جا سکتی، تاہم اس تعداد سے کتب خانوں کی کثرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور مسلم معاشرہ میں کتب خانوں سے عام دلچسپی کا بھی پتہ چلتا ہے یہ بھی دراصل عہد عباسی میں کتب خانہ سازی کی عالمگیر تحریک کا اثر تھا، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کتابی سرگرمی اور کتب خانوں کی ترقی میں عہد عباسی کو خصوصیت خاص حاصل ہو لیکن افسوس ہے کہ اس دور کے کتب خانوں کی تاریخ پر علمی اور تحقیقی انداز میں اب تک ایسا کام نہیں ہوا جس میں اصل ماخذوں کو زیادہ سے زیادہ کھنگالا گیا ہو، فنی نقطۂ نگاہ سے ان کے اسباب و علل کا کھوج لگایا گیا ہو اور ان کے ارتقاء کو عہد بعہد بتایا گیا ہو۔

(د) عہد عباسی میں کتب خانوں کی نشان دہی کے اسباب

مورخین اور تذکرہ نگاروں نے طبقات و سیر کی کتابوں میں حسب ذیل تین اہم اسباب کی وجہ سے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] کتاب الانساب، ج ۱ ص ۲۰۔ [2] سمعانی اور ان کی کتاب الانساب مقالات عرشی، از امتیاز علی عرشی، لاہور مجلس ترقی ادب سنہ ۱۹۷۰ء، ص ۲۲۸

(۱) نہایت غیر معمولی کتب خانوں کو بیان کیا ہے۔[1]

(۲) کسی خاص واقعہ کے ضمن میں اتفاقاً کتابوں اور کتب خانوں کا ذکر ان کے زبان و قلم پر آگیا جیسا کہ مورخ واقدی کے بغداد میں نقل مکانی کی وجہ سے اس کی کتابوں اور اس کے کتبخانوں کا ذکر تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں آگیا۔[2]

(۳) کسی عالم، بادشاہ، امیر، وزیر وغیرہ کی کتابوں سے غیر معمولی شغف کی وجہ سے ضمنی طور پر اس کے کتب خانہ کا تذکرہ کیا ہے۔[3]

ان ہی تینوں اسباب کی روشنی میں اس موضوع پر لکھنے والوں نے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے۔[4]

(ر) عہد عباسی میں کتب خانوں کی شناخت کے رہنما اصول ....

عہد عباسی کے مورخین و تذکرہ نگاروں نے کتب خانوں کی رہنمائی اور نشاندہی جن اشاروں اور فقروں سے کی ہے وہ کتب خانوں کی شناخت کے اساسی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی روشنی میں عہد عباسی کے کتب خانوں کی تعیین کی گئی ہے وہ رہنما اساسی اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) کسی خاص نام سے کتب خانہ قائم کرنا یا کسی کے ذخیرۂ کتب کے لیے خزانہ کا لفظ لکھا جانا مثلاً۔

الف:۔	لہ خزانہ۔[5]	ب:۔	خزانہ کتب[6]
ج:۔	خزائن الکتب۔[7]	د:۔	خزانۃ الحکمۃ۔[8]

---

[1] کتاب صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء، تالیف احمد بن علی، القاہرہ دار الکتب المصریہ ۱۳۳۱ھ ج ۱ ص ۴۶۶ [2] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۵ [3] معجم الادباء ج ۷، ص ۵۰ [4] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۱۶۹، ۲۰۵، ۲۸۲ [5] معجم الادباء ج ۵ ص ۱۵۹، ۲۶۶ [6] کتاب الفہرست ص ۹۰ [7] آثار البلاد و اخبار العباد تالیف ذکریا بن محمد بن محمود القزوینی بیروت دار صادر للطباعۃ والنشر سنہ ۱۳۸۰ھ ص ۳۸۰ [8] فقہ اللغۃ و سر العربیہ تالیف عبد الملک الثعالبی تحقیق مصطفیٰ السقا ابراہیم الابیاری عبد الحفیظ شلبی، ط ۲ مصر مطبعۃ مصطفیٰ البابی ۱۳۹۲ھ ص ۹ [9] کتاب المنتظم ج ۸ ص ۱۱۳ [10] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۳۰۲

و :-	خزانة العلوم	د :-	بيت الحكمة
ز :-	دار الحكمة	ح :-	صوان الحكمة
ط :-	بيت الكتب	ى :-	بيوت الكتب
ك :-	دار الكتب	ل :-	مكتب
م :-	دار العلم	ن :-	دار المعرفة

(۲) کتابیں جمع کرنا۔ مثلاً یہ کہنا۔

الف ۔ اقتنى كتباً كثيرة — اس نے بہت کتابیں حاصل کی تھیں۔

جمع مالم يجمعه احد من اقرانه — موصوف نے اتنی کتابیں جمع کیں جو ان کے معاصرین میں سے کسی نے جمع نہیں کی تھیں۔

د ۔ جمع من الحديث مالم يجمعه احد — موصوف نے حدیث کا اتنا ذخیرہ جمع کیا تھا کہ

---

[1] جمهرة انساب العرب تالیف ابن حزم تحقیق عبد السلام محمد ہارون، مصر، دار المعارف ۱۳۸۲ھ ص ۱۰۰
[2] کتاب الفہرست لابن الندیم، ص ۳۰۱۵، معجم الادباء ج ۵ ص ۶۶ [3] کتاب المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار المعروف بالخطط المقریزیہ، القاہرہ، دار الطباعۃ المصریہ ببولاق ۱۲۷۰ھ ج ۲ ص ۳۴۳ [4] کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون تالیف حاجی خلیفہ، استانبول، مطبعۃ المعارف ۱۳۲۰ھ ج ۱ ص ۶۸۳ [5] کتاب تتمۃ صوان الحکمۃ تالیف علی بن زید البیہقی تحقیق محمد شفیع، لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۳۵۱ھ ص ۴۴، ۵۶، ۱۲۸ [6] ایضاً ص ۴۳ [7] النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، تالیف یوسف ابن تغری بردی، القاہرۃ، مطبعۃ دار الکتب المصریہ ۱۳۴۹ھ ص ۱۳۲
[8] کتاب الانساب ج ۵ ص ۴۵ [9] کتاب الخطط المقریزیہ ج ۱ ص ۴۵۰ [10] تاریخ ابن خلدون ۳ ط بیروت، دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء ج ۴ ص ۷۹ [11] تاریخ الحکماء للقفطی تحقیق جیمس سرٹ، لیزک، تھیوڈر دریچر، ۱۹۰۳ء ص ۳۶۲ [12] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۲۶۵، النجوم الزاہرہ ۵/۴ ص ۱۷۶
[13] کتاب الانساب ج ۱ ص ۲۲۳۔

معاصرین میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔

ج ۔ جمع من الكتب مالم يجمعه غيره — موصوف نے اتنی کتابیں جمع کی تھیں کہ ان کے معاصرین میں سے کسی نے نہیں کی تھیں۔

د ۔ جمع من الكتب مالم يجمعه احد — اس نے اتنی کتابیں جمع کی تھیں کہ کسی نے نہیں کی تھیں۔

ہ ۔ جمع كتباً عظيمة — موصوف نے بڑی کتابیں جمع کی تھیں۔

و ۔ جمع كتباً كثيرة — اس نے بہت کتابیں جمع کی تھیں۔

ز ۔ جمع الكتب الحسان — اس نے عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔

ح ۔ جمع وكتب مالا يحصى — اس نے اتنی کتابیں جمع کی اور لکھی ہیں کہ شمار نہیں کی جاسکتیں۔

ط ۔ جمع من الكتب كثيراً وكان شديد الشغف بها — اس نے بہت کتابیں جمع کی تھیں، اور اسے ان سے بہت شغف تھا۔

پانچویں صدی ہجری میں اس فقرہ کا یہ مطلب تھا کہ اس نے ہزاروں کتابیں جمع کی تھیں؛ اس کا بہت بڑا کتب خانہ تھا، چنانچہ مرہف بن اسامہ المتوفی ۶۱۳ھ کے متعلق منذری نے یہی الفاظ لکھے ہیں، یاقوت نے موصوف کا جو بیان نقل کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے

---

[1] الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، ج ۹ ص ۱۱۰، المختصر فی اخبار البشر تالیف ابو الفداء اسماعیل مصر المطبعۃ الحسینیہ المصریہ ۱۳۲۵ھ ج ۲ ص ۱۳۰ [2] تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۹۹۴ [3] کتاب المنتظم ج ۸ ص ۱۸۰ [4] البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ج ۱۲ ص ۶۳ [5] المنتظم ج ۱۰ ص ۱۲۲ [6] کتاب المنتظم ج ۱۰ ص ۱۲۲، کتاب العبر ج ۳ ص ۵۹ [7] التکملہ لوفیات النقلہ لعبد العظیم المنذری تحقیق بشار عواد معروف، النجف مطبعۃ الآداب ۱۳۹۱ھ ج ۲ ص ۳۱۰

کتب خانہ میں کتابوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ انھیں بھی اس کا صحیح علم نہ تھا، ایک اندازے میں موصوف نے چار ہزار کتابیں فروخت کیں تو بھی پتہ نہ چلا کہ کتب خانہ سے کچھ نکلا ہے[1]

ی ۔ رحل وجمع وصنف[2]	موصوف نے سفر کیا، کتابیں جمع کیں اور تصنیف کیں۔
ک ۔ سمع وجمع وصنف[3]	اس نے احادیث کا سماع کیا، انھیں جمع کیا اور تصنیف کی۔
ل ۔ تعب فی جمعہ وجمع المجموع[4]	موصوف نے جمع حدیث میں بہت مشقت برداشت کی اور مجموعے جمع کیے۔
م ۔ حصل الاصول الثمینۃ[5]	اس نے اصل قیمتی نسخے حاصل کیے تھے۔
ن ۔ حصل الاصول وجمع الکتب[6]	اس نے اصل نسخے حاصل کیے اور کتابیں جمع کیں۔
س ۔ حصل اصولا کثیرۃ[7]	اس نے بہت سے اصل نسخے جمع کیے تھے۔
ع ۔ حصل عندہ من الاصول والاجزاء مالا یوصف کثیرۃ[8]	موصوف نے اصل نسخے اور اجزاء اتنے جمع کیے تھے کہ ان کی تعداد حیطۂ بیان سے باہر ہے۔
ف ۔ حصل کتبا کثیرۃ[9]	موصوف نے بہت کتابیں جمع کی تھیں۔
ص ۔ حصل ... الکتب الجیدۃ[10]	اس نے بہت عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔
ق ۔ حصل کتبا نفیسۃ[11]	اس نے نفیس کتابیں فراہم کی تھیں۔
ر ۔ حصل من الکتب الطبیۃ	اس نے طب وغیرہ کی اتنی کتابیں جمع کی تھیں جو

[1] معجم الادباء، ج ۲ ص ۱۹۶ [2] الانساب ورق ۱۳۴ ب [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۲۳۱۔
[4] الانساب ورق ۹۴ ب [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۸۴ [6] التکملہ لوفیات النقلہ ج ۳، ص ۲۵۵ [7] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۴۰۵ [8] ایضاً ج ۳ ص ۱۱۹۲ [9] البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۵۶ [10] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۶۴ [11] کتاب المنتظم، ج ۱۰، ص ۱۲۱۔

وغیرھا مالا یکاد یوجد عند غیرہ[1]	اس کے معاصرین میں سے کسی کے پاس مشکل ہی سے مل سکتی تھیں۔
ش ،، صرف فیھا زائدا عن خمسین الف دینار فی تحصیل الکتب اشتراءً ونقلا وکتابۃ[2]	موصوف نے پچاس ہزار دینار سے زیادہ رقم کتابوں کی خریداری اور نقل وکتابت کرانے پر خرچ کی تھی۔
ش ،، کان حریصا علی طلب الکتب[3]	وہ کتابیں جمع کرنے کا دلدادہ تھا۔
س ،، کان حریصا علی کتابتہ[4]	وہ حدیثیں لکھنے کا شوقین تھا۔
ث ،، کان حریصا علی نقل الکتب وتحصیلھا[5]	وہ کتابیں نقل کرنے اور حاصل کرنے کا دلدادہ تھا۔
ت ۔ (الف) ابو بشر المفضل حریص علی اقتناء الکتب[6]	ابو بشر مفضل کتابیں جمع کرنے کا دلدادہ تھا۔
ث ،، خلف ماجمعہ فی طول عمرہ من الکتب[7]	عمر بھر جو کتابیں جمع کی تھیں وہ چھوڑ گئے۔
ث (الف)، کان کثیر العنایۃ بتحصیل الکتب[8]	موصوف کو کتابیں حاصل کرنے کی بہت لگن تھی۔
خ ،، کان کثیر الکتب[9]	وہ کتابیں بہت رکھتا تھا۔

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ج ۳ ص ۳۵۰-۳۵۱ [2] الانباہ الرواۃ ج ۲ ص ۳۰۵
[3] عیون الانباء جلد ۲ صفحہ ۱۷۹ - [4] المعجم الکبیر
[5] عیون الانباء، ج ۲ ص ۱۷۹ [6] یتیمۃ الدہر ج ۴ ص ۲۹۴ [7] التاریخ الکبیر لابن عساکر بترتیب تہذیب عبد القادر افندی بدران، دمشق طبعۃ روضۃ الشام، سنہ ۱۳۲۹-۱۳۵۱ھ ج ۳ ص ۳۶ [8] الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ تالیف عبد القادر ابن ابی الوفاء محمد القرشی حیدرآباد الدکن مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ سنہ ۱۳۳۲ھ ج ۲ ص ۱۵۷ - [9] کتاب الانساب ج ۱ ص ۲۲۳ [10] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۶۶ -

خ (الف) کان من المکثرین فی الحدیث کتابۃ وسماعاً۔[۱]	موصوف حدیث کی بکثرت کتابت وسماعت کرنے والوں میں سے تھے۔
ذ :۔ کتب بخطہ الکثیر وحصل الاصول[۲]	اس نے اپنے قلم سے بہت لکھا اور اصل نسخے جمع کیے تھے۔
ض :۔ کتب وحصل الاصول الکثیرۃ[۳]	موصوف نے لکھا اور بہت زیادہ اصل نسخے جمع کیے تھے۔
ض (الف) کتبت وکتب لی عشرۃ احمال[۴]	میں نے لکھا اور میرے واسطے دس بار شتر کتابیں لکھی گئیں۔
ظ :۔ ما رأیت فیمن رأیت اکثر کتباً... ...منہ۔[۵]	میں نے جن اہل علم کو دیکھا ہے اُن میں موصوف سے زیادہ کتابیں کسی کے پاس نہیں دیکھیں۔
ع :۔ نسخ الکثیر وحصل الاصول۔[۶]	اس نے بہت نقل کیا اور اصل نسخے فراہم کیے تھے۔

(۳) علمی ذخیرہ بنانے اور اس میں اضافہ کرنے کے لیے خود کتابیں نقل کرانا یا اجرت پر نقل کرانا، مثلاً یہ کہنا۔

الف۔ کتب الکثیر وجمع ما لم یجمعہ احد من اقرانہ[۷]	اس نے بہت لکھا اور اتنا علمی ذخیرہ جمع کیا کہ اسکے ہمعصروں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔

حافظ ابن الفرات المتوفی سنہ ۴۱۴ھ کے عظیم کتب خانہ کے متعلق اسی قسم کے فقرے لکھے گئے ہیں جس میں ایک ہزار جزء تو صرف علی بن محمد مصری کی روایت سے موجود تھے، سو تفسیریں اور

---

[۱] المنتظم ج ۹ ص ۲۰۰ [۲] الوافی بالوفیات، ج ۸ ص ۲۳۲، الجامع المختصر فی عنوان التواریخ وعیون السیر تالیف علی بن انجب الساعی تحقیق مصطفیٰ جواد، بغداد، المطبعۃ السریانیۃ الکاثولیکیۃ سنہ ۱۹۳۴ء ج ۹ ص ۲۱۳۔ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۶۱-۱۳۶۲۔ [۴] ایضاً ص ۱۳۳۶ [۵] ایضاً ص ۱۳۲۳ [۶] ایضاً ص ۱۲۱۳، [۷] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۴۳، الانساب ورق ۴۳۰ ب کتاب المنتظم ج ۸ ص ۱۷۷، الکامل فی التاریخ ج ۹ ص ۱۰۶، البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۳۱۴ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۲۵

تاریخیں موصوف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی محفوظ تھیں، جب مرے تو اٹھارہ صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے تھے اور یہ وہ کتابیں تھیں جو چوری سے بچ رہی تھیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس مختصر سے جملہ میں کتنی وسعت مضمر ہے۔

ب :۔ کتب بخطہ ما لا یوصف کثرۃ[۱]	اس نے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔
ج ۔ کتب ما لا یوصف کثرۃ ولم یزل ینسخ ویصنف[۲]	اس نے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ برابر نقل کرتا اور تصنیف کرتا رہا ہے۔
د ۔ کتب بخطہ الملیح الرشیق ما لا یوصف کثرۃ۔[۳]	موصوف نے اپنے عمدہ وخوبصورت خط سے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔
ہ ۔ کتب بخطہ السریع الرفیع ما لا یوصف کثرۃ۔[۴]	اس نے اعلیٰ وتیز خط میں اتنا زیادہ لکھا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔
و ۔ کتب بخطہ شیئاً کثیراً۔[۵]	اس نے اپنے قلم سے بہت کچھ لکھا ہے۔
ز ۔ کتب الکتب ونسخ الکتب الکبار[۶]	اس نے کتابیں لکھیں، اور بڑی بڑی کتابیں نقل کیں۔
ح ۔ کتب الکتب الطوال۔[۷]	اس نے لمبی لمبی کتابیں لکھیں۔
ط ۔ کتب بخطہ کثیراً واستنسخ وحصل الاصول۔[۸]	موصوف نے اپنے قلم سے بہت زیادہ لکھا، نقل کرایا اور اصل نسخے حاصل کیے۔
ق ۔ کتب بیدہ عدۃ احمال۔[۹]	اس نے اپنے ہاتھ سے کئی بار شتر کتابیں نقل کی تھیں۔

---

[۱] العبر الذہبی ج ۴ ص ۲۹۸ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۷۳ [۳] ایضاً ص ۱۴۰۲، [۴] ایضاً ص ۱۲۵۲ [۵] تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ ص ۱۴۰۰۔ [۶] ایضاً ص ۱۲۸۳۔ [۷] العبر ج ۳ ص ۱۰۶ [۸] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۱۳، [۹] میزان الاعتدال للذہبی ج ۳ ص ۴۷۵۔

ی۔ کتب الکثیر وصنف وجمع [1]
اس نے بہت زیادہ لکھا، تصنیف اور کتابیں جمع کیں۔

ک۔ سمع مالا یوصف کثرۃ ونسخ بخطہ الصحیح السریع [2]
موصوف نے اتنا سماع کیا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور اپنے قلم سے صحیح اور جلدی نقل کیا۔

ل۔ نقل بخطہ الملیح مالا یدخل تحت الحصر [3]
اس نے اپنے پاکیزہ خط سے اتنا لکھا ہے کہ شمار سے باہر ہے۔

م۔ نسخ واستکتب وصنف وجمع [4]
اس نے کتابیں نقل کیں، کرائیں، تصنیفات کیں، اور جمع کیں۔

ن۔ نسخ لنفسہ ولغیرہ [5]
اس نے اپنے لیے اور غیروں کے لیے کتابیں نقل کی تھیں۔

س۔ کانت النقلۃ یحصلون من جاہہ ویمتازون من فضلہ [6]
نقل نویسوں کو اس کی طرف سے اجرت ملتی اور وہ اسکے لطف وکرم سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

ع۔ کان یصل الی النقلۃ من مالہ و انضالہ شئ کثیر جداً [7]
کتابیں نقل کرنے والوں کو مال بھی ملتا اور اسکی بے پایاں عنایتوں سے بھی سرفراز ہوتے تھے۔

ف۔ کان یقارب عطاءہ للنقلۃ و النساخ فی کل شہر الفی دینار [8]
وہ کتابیں نقل کرنے اور لکھنے والوں کو ہر مہینہ تقریباً دو ہزار دینار دیتا تھا۔

ق۔ کان الوراقون یکتبون لہ [9]
وراق اس کے لیے کتابیں لکھتے تھے۔ (باقی)

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۴ ص ۹۴، الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ ج ۱ ص ۲۷۹-۲۸۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۲۹۹ [3] ایضاً ص ۱۴۱۱ [4] ایضاً ص ۱۲۳۵ [5] ایضاً ص ۱۳۱۲ [6] عیون الانباء ج ۲ ص ۱۰۶ [7] ایضاً [8] ایضاً [9] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۴۴۸، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۴۴-۴۴۵۔

اسلام اور مستشرقین پر دار المصنفین کے بین الاقوامی سیمنار کے متعلق

بعض اہل قلم کے تاثرات

(۲)

۱۔ ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق ڈائرکٹر جنرل، رابطۂ عالم اسلامی، مکہ۔

دار المصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" کے سیمنار میں شریک ہو چکا ہوں، اس موقع پر میں نے اس ادارہ کی زیارت کی اور وہاں کتا کی تصنیف و تالیف میں غیر معمولی علمی جہد و کاوش، دقت نظر اور دیدہ ریزی کا بچشم خود مشاہدہ کیا، مجھے دار المصنفین کے کتبخانہ کو بھی گھوم پھر کر دیکھنے کا موقع ملا اس میں نادر اور ضخیم مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔

یہ حقیقت ہے جیسا کہ وہاں کے علما نے بھی مجھے بتایا کہ یہ برصغیر میں سب سے بڑا علمی و تصنیفی ادارہ ہے جسکو علامہ شبلی نے قائم کیا، اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے بڑھایا، اس ادارہ نے اسلامی و دینی موضوعات پر سو سے زیادہ اہم بالشان کتابیں شائع کی ہیں، یہاں کے علما و مصنفین نئے فارغین کی تربیت بھی کرتے ہیں، اور جدید انداز پر بحث و تحقیق، تالیف و تصنیف اور علمی مقالات و رسائل کی تحریر و ترتیب کی انھیں مشق بھی کراتے ہیں، اس کی حیثیت معنوی تلمذ اور تحریری درس کی ہے۔

اسی ادارہ نے "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک انوکھے طرز کا بے مثال سیمنار منعقد کیا تھا اس موقع پر میں بھی وہاں موجود تھا، سیمنار کی کامیابی کے لیے اس ادارہ کے منتظمین نے بغیر کسی امداد کے

خود بہ نفس نفیس اور ذاتی جد وجہد سے جو انتظام کیا تھا وہ خوش سلیقگی اور حسنِ انتظام کے لیے بے مثال اور قابلِ تقلید ہے۔

۲۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، علی گڑھ | ۲۱ تا ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء تین روزہ "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک سمینار بڑے طمطراق اور تزک واحتشام کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڑھ میں منعقد ہوا جس میں برصغیر کے نامور علما وفضلا اور اساتذۂ جامعات کے علاوہ عرب اور دوسرے ممالک کے ممتاز اربابِ علم وقلم نے بھی شرکت کی، ان حضرات نے مقالے پڑھے اور بحث وگفتگو میں حصہ لیا، دار المصنفین کے اربابِ حل وعقد نے اس عظیم بین الاقوامی سمینار کو خاطر خواہ طور پر صوری اور معنوی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لیے جو اہتمام وانتظام کیا اور مہمان نوازی جس دل سوزی، محبت اور توجہ سے کی وہ بے شبہ دار المصنفین کی روایات کے شایانِ شان اور ان کے عین مطابق تھا، اس اجتماع کی نہایت مفصل روداد حسنِ بیان وزورِ خطابت کی گلکاریوں کے ساتھ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے قلم سے معارف میں مسلسل شائع ہو رہی ہے، اس لیے ہمیں اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ چند گزارشات ہیں جن کا اس موقع پر پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

سمینار میں جو تقریریں ہوئیں اور مقالات پڑھے گئے اگرچہ ان میں بحیثیت مجموعی مستشرقین پر نکتہ چینی اور ان کی مذمت کے ساتھ ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ خدمات کا اعتراف دبی زبان اور ہلکے لب ولہجہ میں کیا گیا اور تنقیص وتہجین کا اظہار بڑے زور وشور اور جوش وخروش سے ہوا، ہمارے نزدیک یہ اندازِ گفتگو اس جیسے اہم علمی اجتماع کے شایانِ شان نہیں تھا، مستشرقین کا معروضی مطالعہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مستشرقین کی ایک فہرست بنائی جاتی، اور جن حضرات کو مدعو کیا جاتا ان سے درخواست کی جاتی کہ جس مستشرق کے کاموں کا انھوں نے جامع اور تحلیلی وتنقیدی مطالعہ کیا ہے، اس کو اس فہرست میں سے منتخب کر لیں، اور سمینار میں اس پر ایک

ایسا مقالہ پیش کریں جس میں مستشرق کی علمی وتحقیقی کاوشوں کے ساتھ اس کی غلط یا لغو بیانی کی بھی نشان دہی کی گئی ہو، اگر ایسا ہوتا تو مستشرقین کے محاسن اور معائب دونوں بیک وقت اہلِ بزم کے سامنے آجاتے اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا کہ فلاں مستشرق سے فائدہ کتنا پہونچا اور نقصان کس درجہ کا اور کتنا ہوا

جن مغربی مصنفین نے اسلام پر لکھا ہے ہمارے خیال میں ان کو دو طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ (۱) مشنریز یا مبلغینِ عیسائیت، اور (۲) مستشرقین، استشراق ایک تحریک تھی جو اٹلی میں پیدا ہوئی، وہاں سے جرمنی میں پھلی پھولی اور پھر فرانس، برطانیہ، ہنگری، ہولینڈ، امریکہ اور روس تک میں پھیل گئی، جرمنی میں اس تحریکِ استشراق کا ذکر علامہ اقبال نے پیام مشرق کے مقدمہ میں جس انداز سے کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے، مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے پہلا گروہ یعنی مشنریز! یہ کھلا ہوا اسلام دشمن طبقہ ہے، اس بنا پر اس کا مقصد ہی اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف زہر چکانی اور دشنام طرازی ہے، ہمارے زمانہ کے مشہور مستشرق پروفیسر گب اور پروفیسر آربیری نے بڑی ندامت اور افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے، اب رہے مستشرقین! تو ان لوگوں کے کام کس درجہ متنوع اور کس کثرت سے ہیں؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کناڈا کے قیام کے زمانہ میں میں نے مستشرقین پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو ایک دن اپنے انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری گیا وہاں اور چند کتابوں کے ساتھ جرمن زبان میں ایک کتاب ملی، جو دو جلدوں میں تھی اور اس میں صرف ان مستشرقین کا تذکرہ تھا جنھوں نے جرمن زبان میں اسلامیات کے کسی موضوع پر لکھا ہے، یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا، اور میں نے قلم رکھ دیا، جو حال جرمن زبان کا ہے کم وبیش فرانسیسی اور انگریزی زبان کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کارنامے اس کثرت سے ہیں کہ فرد واحد کا ان سب پر حاوی ہونا ناممکن ہے، موضوعات کے اعتبار سے یہ کارنامے حد درجہ متنوع ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کو مندرجہ ذیل

اقسام پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) مستشرقین نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں نادر و نایاب مخطوطات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر بڑی کاوش اور محنت سے اڈٹ کر کے چھاپا اور پورا عالم اسلام ان سے استفادہ کر رہا ہے! (۲) مستشرقین نے عربی زبان کی لغت لکھی؛ (۳) عربی کتابوں کا ترجمہ کیا، (۴) اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر کتابیں لکھیں، (۵) اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ، (۶) عرب و ایران کی تاریخ (۷) اسلام کے مختلف نظام مثلاً معاشرتی نظام، اقتصادی نظام سیاسی نظام، اسلام کے فنون لطیفہ مثلاً فن تعمیر، فن خطاطی، مصوری، برتن سازی وغیرہ ان پر کتابیں لکھیں، (۸) قرآن و حدیث کا انڈکس تیار کیا، (۹) انسائکلوپیڈیا کے دو دو اڈیشن، قدیم اور جدید تیار کئے (۱۰) عربی زبان کا علم الالسنہ کی روشنی میں مطالعہ کیا، (۱۱) یورپ پر مسلمانوں کے علمی اور اور تہذیبی احسانات پر کتابیں لکھیں، (۱۲) سیرت نبوی، اس کے ماخذ و مصادر اور اسلام کی تعلیمات پر کتابیں لکھیں، اب غور کیجئے یہ تمام موضوعات و عنوانات خالص علمی اور ان میں سے اکثر سیکولر ہیں، یعنی ان پر بحث و گفتگو کے سلسلہ میں مذہب کا کہیں ذکر ہی نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو ضمناً اور برائے نام، ان پر مستشرقین نے جو داد تحقیق دی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب و ایران میں مستشرقین کی ان کتابوں کا ترجمہ ہوا، یہ گویا اس بات کا اعتراف تھا کہ خود عرب و ایران کے علما و فضلا اب تک ان موضوعات پر جو خود ان کے گھر کی چیز تھے، اس درجہ محققانہ سرمایہ علم پیش نہیں کر سکے تھے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مستشرقین کے ان کارناموں سے اسلامی لٹریچر کے سرمایہ میں غیر معمولی اور نہایت وقیع اضافہ ہوا ہے، تحقیق کی نئی راہیں کھلی ہیں اور ان علوم و فنون کے بہت سے پوشیدہ خزانے ہاتھ آئے ہیں، پھر مسلمان طلبہ کو مغربی طرز تحقیق سے آشنا کر کے ان لوگوں نے عالم اسلام میں مسلمان محققین کی ایک ایسی نسل پیدا کی ہے جو اپنے اپنے ملکوں میں آج نہایت عظیم الشان تحقیقی کام اسلامیات کے مختلف موضوعات پر کر رہے ہیں، بے شبہ مستشرقین کی یہ خدمات علمی حیثیت سے مسلمانوں پر اتنا بڑا

احسان ہے کہ اس سے صرف نظر کرنا یا منکر ہونا خود اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

ہمارے علماء کی جو عام ذہنیت مستشرقین کے بارہ میں ہے، وہ غالبؔ کے اس شعر کے مصداق ہے؛

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنیے، مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری نے سیرت نبوی پر اپنی دقیع کتاب اصح السیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے اڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوطہ میں رد و بدل کیا ہوگا اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے، مجھ کو یہ پڑھ کر سخت تعجب اور افسوس ہوا اور میں نے اپنے مخدوم مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جو اس زمانہ میں نہایت بلند پایہ محقق ہیں اور ان مخطوطات پر جن کی نظر بڑی وسیع اور عمیق ہے، مولانا نے حسب معمول از راہ شفقت بزرگانہ فوراً جواب دیا اور تحریر فرمایا!

"طبقات ابن سعد کا اڈیشن، جس مخطوطہ پر مبنی ہے، میں نے اسے دیکھا اور مطبوعہ اڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے"

اس خط سے اندازہ ہوگا کہ مستشرقین نے اڈیٹنگ کا کام کس دیانت داری سے کیا ہے

بہرحال مستشرقین کے کارناموں کا یہ ایک نہایت اہم پہلو ہے، جو اُن پر گفتگو کرتے وقت کبھی نظر انداز نہیں ہونا چاہئے لیکن یہ ان کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے، دوسرا رخ، افسوس کی بات ہے، کہیں داغ دار ہے کہیں بالکل تاریک ہے، اور یہ وہ موقع ہے جب وہ آنحضرتؐ، قرآن و حدیث اور تاریخ و تصوف اسلام کے بعض مباحث و مسائل پر بحث و گفتگو کے بعد نتائج اخذ کرتے اور ان کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ہم امور ذیل پیش نظر رکھیں۔ (۱) پہلی بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ تمام مستشرقین اس باب میں متفق نہیں ہیں

اور سب کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں ایک نہیں ہے، چنانچہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (قاہرہ) جنھوں نے اپنے دو رفقائے کار کی معیت میں پروفیسر گولڈ زیہر کی ایک نہایت اہم کتاب کا ترجمہ جرمن زبان سے عربی میں "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام" کے نام سے کیا ہے، کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں

(۱) مستشرقین میں جہاں ایسے لوگ ہیں جو من مانی بات کرتے ہیں اور اس لیے خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بربنائے جہالت یا علم کے باوجود گمراہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اس طبقہ میں ایسے حضرات بھی ہیں جو حق بات واشگاف طریقہ پر کہتے ہیں، چنانچہ آگے چل کر گولڈ زیہر کے فضائل ومناقب بیان کرنے کے بعد رقم طراز ہیں "اپنے ان کمالات واکتسابات کے باعث ہی گولڈ زیہر کا شمار ان اکابر مستشرقین میں ہوتا ہے جنھوں نے بقدر استطاعت، اسلام کو اس کی روح، اس کی تعلیمات اور اس کے مذہب کو اور ان عوامل کو جو ان مذاہب (فقہیہ وکلامیہ) کی ایجاد اور ان میں اختلافات کا باعث ہوئے ہیں، سمجھا ہے۔" (۲) دوسری بات یہ ہے کہ مستشرقین کے لیے نبوت اور وحی کی حقیقت جو اسلام میں ہے وہ عموماً ناقابل فہم ہے، کیونکہ اگر وہ سمجھ میں آجائے تو پھر وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوجائیں، اس بناء پر وہ آنحضرتؐ کا مطالعہ دنیا کے ایک عظیم ریفارمر اور ایک عظیم انقلابی شخصیت کی حیثیت سے کرتے ہیں اسلیے ایک متعصب اور ایک کوتاہ اندیش ہیں، ان دونوں میں فرق کرنا چاہیے، (۳) پھر تیسری بات جو نہایت اہم اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں تاریخ اسلام اور اپنے ادبی مآخذ ومصادر کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے، کون نہیں جانتا کہ تاریخ کے قدیم مآخذ میں رطب ویابس اور صحیح وغلط ہر قسم کی روایات بھری پڑی ہیں، ایک مسلمان اغانی میں غلمان وحواری اور محلات شاہی میں عیش وعشرت کے واقعات پڑھتا یا ابونواس کے دیوان کا مطالعہ کرتا ہے تو شرم سے گردن خم ہوجاتی ہے، علاوہ ازیں واقدی، ابن اسحٰق اور طبری اور یعقوبی وغیرہ کا کیا ذکر، خود احادیث اور بعض تفاسیر خصوصاً تفسیر درمنثور (جلال الدین سیوطی) میں

بعض ایسی روایات ملتی ہیں جو ہرگز قابل قبول نہیں ہیں اور جن سے اسلام کی تعلیمات مجروح ہوتی ہیں امام بخاری نے الجامع الصحیح میں صحت کا التزام کیا ہے لیکن ادب المفرد میں نہیں کیا، اس لیے اس میں بھی بعض اس قسم کی روایات نے جگہ پالی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بعض روایات کو محض یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ یہ روایت آنحضرتؐ کے شان نبوت کے منافی ہیں پھر تصوف کی کتابیں اور صوفیہ کے تذکرے بھی ایسے اقوال وملفوظات اور ایسے احوال ومقامات کے ذکر سے محفوظ نہیں ہیں جن کی زد شریعت پر پڑتی ہے، مستشرقین جب ہرزہ سرائی پر آتے ہیں تو یہی روایات ان کا سہارا بنتی ہیں، خوب اچھی طرح یاد ہے جس زمانہ میں ہم لوگ ڈابھیل ضلع سورت گجرات میں مقیم تھے سورت کے گجراتی زبان کے ایک ہندو اخبار نے اسلام کے خلاف زہریلے مضامین کا ایک سلسلہ قسط وار شائع کرنا شروع کیا، جب اس مضمون کی سترہ قسطیں شائع ہوچکیں اور حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ الکشمیری مرحوم کو اسکی اطلاع ہوئی تو ایک طرف آپ نے حکومت کو ادھر متوجہ کرکے اخبار پر مقدمہ دائر کرایا اور دوسری جانب اس مضمون کا اردو میں ترجمہ کرانے کے بعد مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور خاکسار راقم الحروف ہم تین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی، جس کا کام اخبار مذکور کے مضمون کو از اول تا آخر پڑھنا اور پھر اس کا جواب تیار کرنا تھا، اب اس تقریب سے یہ رسوائے زمانہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ مضمون میں اسلام کے متعلق جو باتیں لکھی گئی تھیں ان میں سے اکثر باتیں کسی نہ کسی روایت کے حوالہ سے لکھی گئی تھیں اور نہ وہ حوالے درست تھے،

بہرحال اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ اب جبکہ دارالمصنفین کے سمینار میں ایک منظور کردہ تجویز کے مطابق اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مستقل کام کرنے کی غرض سے ایک عالمی ادارہ قائم ہو رہا ہے جس کا سکریٹریٹ دارالمصنفین اعظم گڈھ ہوگا، اور ہر دو برس کے بعد اس ادارہ کی

طرف سے ایک بین الاقوامی سمینار کسی ایک نئے ملک میں منعقد ہوتا رہے گا، چنانچہ اجلاس دوم کیلئے قطر سے اور اجلاس سوم کے لیے پاکستان کی جانب سے دعوت آچکی ہے اور وہ منظور بھی ہوگئی ہے، ہم مندرجہ ذیل گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:۔

(۱) ایک وسیع لائبریری قائم کی جائے جو دنیا بھر کے تمام مستشرقین کی کتابوں اور ان کے مقالات نیز انکے مصادر ومراجع پر مشتمل ہو، (۲) ادارہ کے کارکنوں کے دو سکشن ہونے چاہئیں، ایک سکشن کا کام ہوگا مستشرقین کی کتابوں کا پڑھنا اور ان میں جو قابل گرفت چیزیں ہیں انکی نشان دہی کرنا، اور دوسرے سکشن کا کام ہوگا مراجع ومصادر کا مطالعہ کرکے خالص علمی اور تحقیقی بنیادوں پر روایات متعلقہ کا تنقیدی جائزہ لینا اور صحت وعدم صحت کے اعتبار سے ان کی حیثیت ونوعیت متعین کرنا، (۳) آیندہ جو سمینار ہو اس میں شرکاء کو الگ الگ کسی ایک خاص مستشرق پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی جائے، یہ کام جزوی طور پر مصر میں ہوا ہے، اس سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۲۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ، نئی دہلی،

فروری ۸۲ء کے آخری ہفتہ میں (۲۱ تا ۲۳ فروری) دارالمصنفین (شبلی اکاڈمی) اعظم گڈھ میں ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا، اس علمی اجتماع میں بحث کا موضوع "اسلام اور مستشرقین" تھا اس میں ہندوستان کی عربی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کے عالموں اور دانش وروں کے علاوہ سعودی عرب، قطر، پاکستان، تھائی لینڈ، جاپان اور ڈربن (جنوبی افریقہ) کے عالم اور دانشور شریک ہوئے، افتتاحی اور اختتامی اجلاس دونوں کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی، دونوں اجلاسوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بھی تقریریں ہوئیں، جو ان کے خاص اسلوب بیان اور فکر انگیز مواد کی وجہ سے اس مجمع علمی میں بہت پسند کی گئیں، صدر جلسہ کی فصیح وبلیغ عربی نے موضوع کی اہمیت کو اور بھی اجاگر کیا، تینوں دن مقالہ خوانی کی نشستیں، مقالات کی علمی متانت، تبادلۂ خیال کے معیار اور شرکاء کی کثرت کے اعتبار سے بڑی

پر رونق تھیں، اس سے ضلع اعظم گڈھ کے پڑھے لکھے طبقہ کے علمی و دینی مذاق کا بھی اندازہ ہوا، اور دارالمصنفین کے علمی کاموں کی قدر و اہمیت کا بھی، اور اس بات کا بھی کہ اس ضلع کے تعلیمی و علمی حلقہ کو دارالمصنفین کے وجود اور اس کی تصنیفی سرگرمیوں سے کتنی دلچسپی ہے،

شبلی اکاڈمی کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہیں، سمینار کے موقع پر ان کے حسن انتظام میں سوز و ساز کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، اکاڈمی کی عمارتیں خوب سجی تھیں، ان عمارتوں کے چھوٹے سے مجموعہ میں اکاڈمی کی مسجد دلہن بنی ہوئی تھی، شب میں بجلی کے روشن قمقموں میں اکاڈمی کا پورا احاطہ ایک عجیب پُر اسرار حسن کا سماں پیش کرتا تھا، یہ سماں اتنا دلکش اور سحر انگیز تھا کہ شہر کے لوگ خصوصاً برقعہ پوش عورتیں اس طرح اسے دیکھنے آتی تھیں جیسے کسی مقدس مقام کی زیارت کرنے آئی ہوں، رات ہو کہ دن، اس کے احاطہ کے حسن اور دلکشی کا راز بھی درحقیقت اس بات میں ہے کہ یہاں سیرۃ النبی لکھی گئی جس کے عظیم المرتبت مصنف علامہ شبلی اس کی خوبصورت مسجد کے پائیں ابدی نیند سو رہے ہیں،

سیرۃ النبی صلعم کے سلسلہ کا آغاز حضرت علامہ کا توشۂ آخرت تھا، آنحضرتؐ سے تعلق قلبی رکھنے والے اور آپؐ سے محبت کرنے والے ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھتے ہیں، تو دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے، نہ معلوم ان اشعار کی آمد کے وقت خود علامہ پر کیا گزری ہوگی۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی	مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ	خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا خطبۂ استقبالیہ بڑا پُر مغز تھا اسمیں جہاں ایک طرف اس بات پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ دارالمصنفین کے قیام کا کیا مقصد تھا، وہیں ایسے اشارات بھی تھے کہ اس علمی ادارے نے اس مقصد کو کہاں تک پورا کیا اور چونکہ یہ مقصد ایک پیغام بھی تھا، اس لئے دارالمصنفین اس علمی اجتماع کے ذریعہ اپنے مقصد اور پیغام کو گزشتہ اڑسٹھ سال کی طرح ہمیشہ زندہ و

و متحرک رکھنے کا عزم رکھتا ہے، اور دنیا کے تمام عالموں اور دانش وروں کو اپنے اس علمی سفر میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے، سمینار اور اس ادارہ کے بانی علامہ شبلی مرحوم اور ان کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے خیالات بیان کر کے عام کرنا چاہتے ہیں، باخبر حضرات جانتے ہیں کہ جن مقاصد کے تحت دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا ان میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دین اسلام سیرت نبوی اور اسلامی علوم و فنون سے متعلق جو تحقیقات ہوتی رہتی ہیں ان کا جائزہ لیا جاتا رہے، جہاں جو کام اچھا دکھائی دے اس کی داد دی جائے اور جہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کوئی غلطی نظر آئے اس کی نشان دہی خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں کی جائے، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا تھا۔

"..... مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں (۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور ناتمکمل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔..... (۲) (جو) عربی زبان، علم و ادب، تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارح اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمنی کا مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، تو اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں جب وہ اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول

جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے، جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکے (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۴) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، وہ نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے، (۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولیوس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ۔ ؎

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

"مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعوی نہیں ہو سکتا لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افترا اور تعصب و تاویل کی مثال کے لیے پیش نہیں کی جا سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے،

"یوروپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کو معذور سمجھ سکتے ہیں، (۱) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ وغیرہ..... لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے اعتبار سے بلند رتبہ ہو..... آنحضرت کی سوانح عمری

کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بروایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے، مثلاً (مارگولیوس) تو اوّل تو وہ اس فن کا ماہر نہیں اور جو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے۔ (۲) دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب ... فرض کرو ایک چھوٹے سے چھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے لحاظ سے صحیح واقعہ معلوم ہوتا ہو، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے بہنیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کرلی جائے گی۔"

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مستشرقین کی جماعت سے متعلق لکھا تھا۔

"یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے یوروپین لٹریچر کو نئے نئے اسلوب میں شائع کیا وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم وآداب کی حفاظت واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا، ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لیے وہ ہمدردی و محبت جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہوسکتی ہے، ان کو نہیں ہے، اس لیے ان کی تحقیق و تدقیق سے جہاں فائدہ ہو رہا ہے، سخت نقصان بھی پہونچ رہا ہے، جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم پر نظر ڈالکر تحقیق وریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ بنا کر اسلام، داعی اسلام

اور اسلامی علوم وآداب اور اسلامی تہذیب و تمدن پر بے پناہ حملے کر رہا ہے، قرآن مجید حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام وفقہ، سب اس کی زد میں ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہنچ رہا ہے، اور پہونچے گا، اگر یہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمان دماغوں میں سمیت سرایت کر جائے گی۔"

حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے یہ خیالات پورے سمینار پر چھائے رہے، مقالہ نگاروں میں سے کئی نے مستشرقین کے کام میں جو اچھے پہلو تھے، انہیں سراہا لیکن بعض پہلوؤں کی مضرت رسانی اور غلط کاریوں کی نشاندہی بھی علمی انداز میں کی اور یہی متوازن انداز فکر بھی ہے، مولانا علی میاں کی تقریروں میں بھی یہی متین اور متوازن زاویہ نظر نمایاں تھا، لیکن مقالہ نگاروں میں ایسے یک رخے بھی تھے جو "صراط مستقیم" سے ہٹے ہوئے تھے اور جو تمام مستشرقین کی پوری پوری خبر لینے ہی میں اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے غیظ وغضب کا نشانہ وہ لوگ بھی بنے جو یورپ یا امریکہ کی کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور جن کی بدبختی سے انکے اساتذہ میں کوئی مستشرق بھی ہے، ایسے لوگوں کو ہم یک رخا اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے اسلام اور ایمان کا پیمانہ نہایت محدود اور بہت تنگ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مستشرقین کے شاگردوں میں ایسے لوگ بھی ہوسکتے ہیں جنھیں اللہ تعالےٰ اپنی خاص رحمت سے نواز سکتا ہے، کیا خبر کہ ایسے مسلمانوں کو طوفان مغرب نے بہتر مسلمان بنا دیا ہو اور جس محاذ پر وہ خود دیر تک نہیں ٹھہر سکتے وہاں ان مسلمانوں کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہوں، اللہ کی رحمت ہر شے پر چھائی ہے، نہ معلوم اس خزانۂ غیبی سے کسے کس وقت، کیا مل جائے،

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے پہلے تین دہوں میں علم الاستشراق کی جو صورت تھی وہ آج

نہیں ہے، آج مستشرقین کا وہ علمی معیار نہیں رہا ہے جو پہلے تھا، دوسرے یہ کہ اب خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد، مسلم ممالک کی آزادی، ان پر ان ہی کی حکمرانی اور مسلمانوں کی عام بیداری نے مغرب و مشرق، دونوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اسلام اور اسلامی تمدن کو لاشۂ بے جان تصور کر کے ان کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا جا سکتا، وہ زندہ حقیقتیں ہیں، وہ فنا کبھی نہیں ہوئی تھیں، ہاں دب گئی تھیں اور اب پھر ابھر کر سامنے آ گئی ہیں، اس لیے آج مستشرقین باوجود اپنے سیاسی و مذہبی تعصب کے خالص علمی سطح پر اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور اسلامی علوم و آداب اور تہذیب و تمدن پر اس قسم کے حملے کر کے جیسا کہ پہلے ہوا کرتے تھے، بچ کر نکل نہیں سکتے، اب خود ان ہی سے استفادہ کیے ہوئے اپنے مسلمان عالموں اور دانش وروں کی ایک جماعت دنیائے اسلام میں پیدا ہو چکی ہے جو ان کی غلط اندیشیوں کی نشان دہی کر سکتی ہے اور جو تحقیق و ریسرچ کے جدید اصولوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ انہیں برتنے کا سلیقہ بھی رکھتی ہے، ابھی حال میں طیبادی مرحوم نے جو چند مہینے ہوئے لندن میں ایک حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اپنے چند ہم عصر مستشرقین کی علمی کارگیری کا پردہ فاش کیا تھا، جس کا جواب اگرچہ مستشرقین کے حلقے سے دینے کی کوشش کی گئی، لیکن مغرب اور مشرق دونوں جگہ اہل نظر نے دیکھا کہ ان کی بات کچھ یوں ہی سی رہی۔

ایسا نہیں ہے کہ پہلے ایسے خود دار اور باحمیت عالم اور دانشور نہ تھے جو مستشرقین کو چیلنج کر سکتے، سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سر سید، امیر علی، اقبالؒ سب نے اپنے اپنے طور پر یہ خدمت انجام دی، لیکن اب پہلے کے مقابلہ میں دنیائے اسلام ہر لحاظ سے بہتر حالت میں ہے، اس لیے اب ہمیں مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ملتی ہے، اب مسیحی دنیا کو خود الحاد اور مادیت سے خطرہ ہے جس نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، اس لیے وہ مشترک روحانی و اخلاقی اقدار کے فروغ و استحکام کے لیے دنیائے اسلام سے تعاون کی خواہاں ہے اور رومن کیتھولک چرچ نے تو یہاں تک تسلیم کر لیا ہے کہ

حضرت محمدؐ خدا کے پیغمبر تھے، پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں پروفیسر گب جیسے مستشرق گزرے ہیں جو اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جو دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن اس تلاش و جستجو کی راہ میں پہلا قدم ہی غلط اٹھتا ہے جو انھیں مسلمانوں سے دور کر دیتا ہے، اور مسلمانوں کے نزدیک روحانی اقدار کا جو سرچشمہ ہے اس کی ماہیت و کیفیت سے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے، مثلاً ایسے عیسائی بھی جو مشترک روحانی اقدار کی تلاش میں ہیں، قرآن کو وحی الٰہی تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن کی اساس یہودی و نصرانی روایات ہیں، حالانکہ جب سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹیفک تاریخی اصول تنقید کا چرچا ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک یہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچ سکا اور صرف ایک مفروضہ ہی رہا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصہ تک تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ تاریخی تنقید و تحقیق کے جدید اصولوں کو برت کر عیسائی و یہودی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کر سکی کہ قرآن کریم پیغمبر اسلامؐ کی تالیف ہے، جسے آپؐ نے یہودی و عیسائی روایات سے استفادہ کر کے اور تورات اور انجیل مقدس سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا ہے اس سلسلے میں اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن ہے جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے، تاریخی تنقید و تحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویزی شہادت کو جس کے علاوہ کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام لایعنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہئے، لیکن آج بڑے اور سنجیدہ مستشرقین بھی اس زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ان مستشرقین کے اس رویہ کی توجیہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور اس سلسلہ میں تعصب اور جانبداری کی وہ روایات جو انھیں اپنے علمی ماحول اور

اپنے پیش رووں سے ورثہ میں ملی ہیں ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اور رہ راہت، کی طرف بڑھنے نہیں دیتیں۔

دوسروں کے مذہبی عقائد اور دینی روایات کے موضوع پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنے مطالعہ کے نتائج شایع بھی کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف و تالیف کا اولین و بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے پیرووں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ، مکمل طور پر اس طرح بیان کر دیئے جائیں کہ اس شکایت کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، اب اگر لکھنے والا کسی اور نظریہ یا عقیدہ کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریہ یا کسی نظریہ کا ذکر کرنا چاہتا ہو تو اسے اس کا حق حاصل ہے لیکن اسے چاہئے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریہ کو الگ سے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرے۔

افسوس ہے کہ سنجیدہ اور بالغ نظر مستشرقین بھی قرآن پاک اور سیرت اقدس پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عام طور پر فراموش کر دیتے ہیں اور کچھ اس طرح کا خلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدہ کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا چاہتا ہے، تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے چند بنیادی تقاضے ہیں، لیکن عام طور پر مستشرقین کا حال یہ ہے کہ ان کی یہودیت یا مسیحیت، ان بنیادی تقاضوں پر غالب آجاتی ہے، تاریخی معروضیت کے بلند و بانگ دعووں کے باوجود مغربی مصنفین، دوسرے مذاہب اور تمدنوں کے بارے میں اتنے بھی معروضی نہیں جتنا کہ آج سے صدیوں پہلے ابوریحان البیرونی نام کا وہ مسلمان عالم اور دانشور تھا جس نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند لکھ کر تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی صحیح راہ متعین کر دی تھی،

مولوی محمد فاروق میر واعظ کشمیر

مخلص و محترم زید مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

خیریت ہے، خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو؟

"معارف" ہر ماہ پابندی سے خاکسار کے نام آرہا ہے، شکریہ کثرتِ کار اور دیگر اہم مشاغل کے باوجود پورے ذوق و شوق سے معارف کا مطالعہ جاری رکھتا ہوں،

"اسلام اور مستشرقین" کے عنوان پر جو بین الاقوامی حالیہ سمینار آنمحترم نے اپنے رفقائے کار کے تعاون سے منعقد کیا تھا، یقیناً ہر لحاظ سے کامیاب اور ایک بامقصد سمینار رہا۔

بذاتِ خود شرکت سے تو میں محروم رہا، لیکن آپ نے روداد کے ذریعے ساری تفصیلات قاری کے سامنے کر دی ہیں، میری دلی دعائیں آنحضرت کیساتھ ہیں، کار لائقہ سے مطلع فرمائیں؛ دعواتِ صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام

(محمد فاروق میر واعظ کشمیر)

مقالاتِ شبلی جلد ششم

سلسلۂ مقالاتِ شبلی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ اس سلسلہ کی تیسری جلد ہے، اس میں مولانا کے وہ تمام معرکۃ الآرا و تاریخی مقالات آگئے ہیں، جو انھوں نے یورپ کے اسلام دشمن مستشرقین اور تنگ نظر ہندو مورخوں کے جواب میں، الندوہ لکھنؤ اور اپنے دور کے دوسرے بلند پایہ رسالوں اور اخباروں میں لکھے تھے، ان میں سب سے اہم مضمون کتب خانہ اسکندریہ ہے، جس میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے جلانے کا الزام مسلمانوں پر غلط ہے، یہ اون کے مصر میں داخل ہونے سے بہت پہلے جلا دیا گیا تھا۔

قیمت ۱۔ الر روپے

مطبوعات جدیدہ

آنکھیں ترستیاں ہیں: ۔ مرتبہ جناب جگن ناتھ آزاد صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت عمدہ صفحات ۲۱۳ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت ۳۶ روپیے پتہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نمبر ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بچپن ہی سے شعری، ادبی اور علمی ماحول ملا اور ان کی نشو و نما ادیبوں اور شاعروں کے درمیان میں ہوئی، ان کے والد بزرگوار تلوک چند محروم اساتذۂ سخن میں تھے، جن کے اکثر مشاہیر علم و ادب سے تعلقات تھے، اس کے علاوہ خود آزاد صاحب نے بھی اپنے علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے سرکاری ملازمت سے وابستہ رہنے کے باوجود ہمیشہ علم و ادب سے اشتغال اور ادیبوں اور شاعروں سے واسطہ رکھا، زیر نظر کتاب اُن بائیس ۲۲ علمی و ادبی شخصیتوں کا دلچسپ تذکرہ ہے جن سے مصنف احترام و عقیدت یا دوستی اور بے تکلفی سے ملتے جلتے رہے ہیں، ان میں ان کے بزرگ اور استاد بھی ہیں جیسے تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، عبد المجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولوی عبد الحق، سر شیخ عبد القادر، عبد القادر سروری، محمد دین تاثیر، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی اور ان کے والد محروم صاحب، بعض لوگ سن و سال کے فرق کے باوجود ان کے ہمسر اور بے تکلف احباب ہیں، مثلاً عرش ملسیانی، بنے بھائی (سجاد ظہیر)، کرشن چندر، جاں نثار اختر اور کچھ خورد بھی ہیں یعنی مہندر ناتھ، سلیمان اریب، نریش کمار شاد اور پریم ناتھ در، بعض شخصیتیں اصلاً تو علمی و ادبی ہیں مگر انھوں نے سیاسی افق پر زیادہ چمک دمک دکھائی جیسے مولانا ابو الکلام آزاد، سروجنی نائیڈو اور درگا پرشاد دھر، مصنف نے ان سب سے اپنی ملاقات کی سرگذشت، تعلقات کی روداد اور

ان کے بارہ میں اپنے تاثرات و مشاہدات بہت دلچسپ اور موثر انداز میں بلکہ خود ان کے بقول "ذوق حضوری" سے لکھے ہیں جس سے ان کے حالات و کمالات کا مرقع، علمی و ادبی سرگرمیاں، افکار و خیالات اور دوسرے مشاغل و معمولات کا حال معلوم ہو جاتا ہے، ایسی علمی و ادبی شخصیتوں کا تذکرہ اور وہ بھی جگن ناتھ آزاد کے سلاست رقم اور شگفتہ نگار قلم سے "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" کے مصداق ہے، جن لوگوں کا اس کتاب میں تذکرہ ہے وہ وفات پا چکے ہیں اس لیے ہر مضمون سوز و اثر میں ڈوبا ہوا ہے، مصنف کو شعر و ادب میں جو بصیرت حاصل ہے اس کی بنا پر ان کے بعض خیالات دوسروں سے مختلف ہیں جو غور و فکر پر مبنی ہونے کی وجہ سے لائق توجہ ہیں، چنانچہ شہرت عام کے برعکس فراق کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ ہے "وہ متنوع موضوعات کا شاعر نہیں ... ان کی رباعیات ان کی غزل ہی کا ایک دوسرا روپ ہیں ... ان کی زیادہ تر نظمیں سپاٹ اور شعریت سے معرا ہیں، غزل کی روایتی ... حدود کے باہر اول تو فراق نے کچھ کہا ہی نہیں اور جو کچھ کہا ہے، وہ درجۂ اول کی تخلیق نہیں، ... ہمارے نقاد فراق کی شاعری سے اتنا متاثر نہیں جتنا ان کی مقبولیت سے متاثر ہیں، اور اس مقبولیت میں فراق کی شاعری کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا ان کی ذہانت اور عالمانہ گفتگو کا ... فراق کے ادب کو غیر ادبی پیمانے سے ناپنے کا طریقہ فراق کی گفتگو اور محفل آرائی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا" (ص ۱۶۲، ۱۶۱) وہ فیض کی شگفتگی اور تاثیر کے معترف ہونے کے باوجود یہ بھی کہتے ہیں کہ "ان کے یہاں زبان کی غلطیاں ہیں اور انداز بیان کہیں کہیں اتنا کھردرا ہے کہ پڑھتے ہوئے بہت کوفت ہوتی ہے" (ص ۱۵۱) کرشن چندر کے اس خیال "شاعری میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل چیز خیالات ہیں" کی تردید میں لکھتے ہیں، خیالات کا ہونا تو ضروری ہے، لیکن زبان و بیان کی اہمیت سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے، اعلیٰ شاعری تخیلات، زبان و بیان اور جذبے کے امتزاج ہی سے ظہور میں آتی ہے، اگر خیالات کمزور ہیں یا زبان و بیان کمزور ہوں تو شاعری بحیثیت

مجموعی کمزوری رہے گی" (ص ۱۵۱) وہ ڈاکٹر اقبال کے عاشق وشیدائی ہیں، کوئی محفل ہو وہ ان کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے خلاف ترقی پسندوں کے مخالفانہ طلسم کو توڑنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے، وہ بھلا ان کے معاملہ میں کوئی بدذوقی کب برداشت کر سکتے ہیں، لکھتے ہیں "کرشن چندر کو اقبال کے متعدد اشعار سنائے ...... انھیں یہ اشعار پسند نہ آئے وہ بار بار فیض اور راشد کا ذکر کرتے تھے اور میں اقبال کے مقابلے میں فیض اور راشد کا ذکر سننے کو تیار ہی نہیں تھا، میں نے لفظوں میں تو اس بات کا اظہار نہ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس بات چیت سے بڑی حد تک مایوس ہوا اور بے لطف بھی" (ص ۱۵۰) اصحاب علم وفن کا تذکرہ ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں جا بجا ادبی نکتے، مفید معلومات اور لطائف وظرائف بھی احاطۂ تحریر میں آگئے ہیں، جنھیں پڑھ کر لطف اندوز ہونا یقینی ہے اور اس سے خصوصیت کے ساتھ پنجاب کی گذشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں اور واقعات کی تصویر سامنے آجاتی ہے، خود مصنف کی پوری زندگی بھی شعر وادب کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، جس کا بہت کچھ حال انھوں نے قلمبند کیا ہے، اس طرح یہ جگ بیتی ہی نہیں، آپ بیتی بھی ہے، کتابت کی غلطی سے واقعہ کو واقع (ص ۱۳۶) نذر کو نظر (ص ۱۷۱) خزف چینوں کو حذف چینوں (ص ۴۴) اور جگہوں کو ذکر لکھا ہے، (ص ۳۴) مزاجی رجحان (ص ۱۴۱) کے بجائے طبعی رجحان لکھنا چاہئے تھا، مندرجہ ذیل جملے میں طریقۂ ادا کی خامی ہے، "سروجنی نائیڈو کے ساتھ صرف ایک ہی بار ملاقات ہوئی" (ص ۷)

منارِ صدا :- مرتبہ ڈاکٹر عنوان چشتی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۷۸ مع خوبصورت جلد قیمت ۳۵ روپے، پتہ :- ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو علم کی دولت اور دین کی برکت وراثۃً بھی ملی ہے اور وہ خود بھی علمی ودینی وجاہت کے مالک اور مشہور قومی وملی رہنما ہیں، ندوۃ المصنفین کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کی وجہ سے انھیں تصنیف وتالیف کا موقع نہ مل سکا مگر ان کی نگرانی میں اس ادارہ نے بڑی مفید علمی ودینی خدمت انجام دی ہے، زیر نظر کتاب مفتی صاحب کی ان ریڈیائی تقریروں کا

مجموعہ ہے جو گذشتہ تقریباً ۳۰ برسوں میں وقتاً فوقتاً مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتی رہی ہیں، اب ڈاکٹر عنوان چشتی ریڈر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے عام فائدہ کے لئے ان کا مجموعہ سلیقہ سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، اور موضوع کے لحاظ سے ان کے چھ حصے کر دئے ہیں، پہلے حصہ میں سیرت پاک اور میلاد النبی پر آٹھ تقریریں ہیں، دوسرے میں حج، اس کے ارکان ومناسک اور آثار ومشاہد پر تیرہ تقریریں درج ہیں، اس کے بعد کے حصوں میں عید قربان پر ۹ عید الفطر پر چار، اور شب برات پر تین تقریریں شامل ہیں، آخر میں مختلف موضوع پر پندرہ تقریریں ہیں ان میں امام حسینؓ، عشرۂ محرم، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، مخدوم صابر کلیری، درگاہ خواجہ معین الدین چشتی، سلسلۂ نقشبندیہ، حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات، مسلم پرسنل لاء، مذہبی رواداری، عرب وہند کے تعلقات اور ہندوستان اور سیکولرزم کے علاوہ دار العلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور ندوۃ المصنفین دہلی جیسے بڑے اداروں پر مفتی صاحب نے مناسب انداز میں اظہار خیال کیا ہے، یہ سب تقریریں موثر، عام فہم اور دین ومذہب سے متعلق مفید باتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں، گو ریڈیو کے محدود ومتعین وقت کی پابندی کی وجہ سے یہ مختصر ہیں اور بعض بعض ایک ہی موضوع پر ہیں، اس لیے ان میں تکرار بھی ہے، مگر اس سے ان کی دلپذیری میں فرق نہیں آیا ہے۔

علامہ اقبال (مصلح قرن آخر) مترجمہ جناب کبیر احمد جائسی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ قیمت بارہ روپیہ ۱۲ شائع کردہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، کشمیر۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے اقبال پر دوسرے ملکوں اور زبانوں میں ہونے والے مفید ومنتخب کاموں کے ترجمہ واشاعت کا پروگرام بنایا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے، یہ دراصل ایک ایرانی فاضل ڈاکٹر علی شریعتی کی ایک تقریر ہے، شروع میں اہل ایران سبک ہندی کے معترف

اور ڈاکٹر اقبال کو ایک مقامی شاعر سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اب وہاں اقبال شناسی کا رجحان بڑھ رہا ہے، اس لیے دورِ حاضر کے متعدد فضلا ان کی عظمت و آفاقیت کے قائل ہیں، ڈاکٹر علی شریعتی بھی اقبال کے افکار و خیالات سے کافی متاثر ہیں، انھیں پہلوی حکومت اور شا[ہ] ایران کے خلاف بغاوت کے جرم میں بار بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور آخر میں وہ ملک بد[ر] ہو کر لندن گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا، اس طرح انھیں جم کر پڑھنے لکھنے اور یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا موقع نہ ملا، ان کی علمی یادگار ان کی تقریریں ہیں، جنکی تعداد سو سے متجاوز ہوگی، زیر نظر تقریر میں اقبال کو ایک بڑا مصلح بتایا ہے، مقرر کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا دل مشرقی اور دماغ مغربی تھا، وہ انھیں کامل اور مکمل مسلمان اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا معمار سمجھتے تھے، ان کے نزدیک وہ عام صوفیہ، مصلحین اور انقلاب پسند مجاہدین کی طرح نہ تھے، بلکہ استعمار دشمن تھے، اس سلسلہ میں اقبال کی عظمت و جامعیت پر اچھی بحث کی ہے گو اس تقریر میں بہت غیر متعلق باتیں اور بعض ضمنی مسائل کی غیر ضروری تفصیل بھی ہے اور بعض خیالات بھی محل نظر ہیں تاہم اس سے مقرر کی دینی تڑپ اور اسلام کی سربلندی کے جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اور ڈاکٹر اقبال کے خیالات میں بڑی یکسانی ہے، اس کتاب کے مترجم جناب کبیر احمد جائسی کو فارسی کتابوں کے ترجمے کا اچھا سلیقہ ہے، ترجمہ کی پابندی اور موضوع کی خشکی کے باوجود اس میں رعنائی و دلکشی ہے، شروع میں انکے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے اس میں ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم کے حالات و سوانح اور ان کے بارہ میں مفید اور ضروری معلومات درج ہیں۔

"ض"

……٥……

مولانا سید سلیمان ندوی کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبۂ صدارت ان کی دوسری تقریروں تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ اُن کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت :- ۲۵ روپیے،

خیّام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوا اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا منجم تھا، ریاضی داں تھا ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلی نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی انہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں،

طبع دوم عکسی، قیمت : ۲۵ روپیہ،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت :- ۳۰ روپیہ

"منیجر"